# احوال و افکار و آثار

# میر شمس الدین فقیر عباسی دہلوی

ہند است ایں سینہ ریشان — خاکش درمان درد کیشان

درخاک دی است گنج عرفان — چون در ظلمات آب حیوان

فقیر دہلوی

ڈاکٹر محمد شہاب الدین

## احوال و افکار و آثار

# میر شمس الدین فقیر عباسی دہلوی


مرتبہ

**ڈاکٹر محمد شہاب الدین**

ایم۔ اے۔ (فارسی و اردو) —— پی ایچ۔ ڈی

لکچرار شعبۂ فارسی، ٹی۔ این۔ بی۔ کالج، بھاگلپور

بھاگلپور یونیورسٹی۔ بھاگل پور (بہار)



یہ کتاب فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت یو۔پی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی

فقیر دہلوی کے اشعار ہندوستان کی تعریف میں
(مثنوی والہ و سلطان، خدا بخش قلمی)

DR. Md. Shahabuddin

- پہلا ایڈیشن ——— نومبر ۱۹۸۵ء
- کاتب ——— وحید رضا انصاری
- مطبع ——— نکھار پریس، مئو
- تعداد کتاب ——— ۶۰۰ مجلد (۲۴)
- قیمت ———
- ناشر ——— ڈاکٹر محمد شہاب الدین، قاضی ولی چک، بھاگلپور ۔ ۲

تقسیم کار:- نکھار پبلی کیشنز، مئوناتھ بھنجن، (یوپی)





ملنے کے پتے

- محمد مشتاق رضا، شاہ مارکیٹ خلیفہ باغ بھاگلپور
- مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی
- نیو کتاب منزل، تاتار پور، بھاگلپور
- گل مہر بک ڈپو، سبزی باغ، پٹنہ
- بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ


# انتساب

▲ حضرت مولانا شہباز محمدؒ دیوری ثم بھاگلپوری

▲ حضرت مولانا فضل رحمٰنؒ گنج مرادآبادی

▲ اپنے والدِ محترم محمد عبدالوہاب مرحوم و مغفور

اور

▲ اپنی والدہ محترمہ کے نام

ڈاکٹر محمد شہاب الدین

# فہرست

# دیباچہ

لذتِ قندِ مکرری دہد شعرِ فقیر

آج سے تقریباً گیارہ سال قبل استاذی محترم ڈاکٹر عبدالغفار انصاری ریڈر اور صدر شعبۂ فارسی، ٹی۔ این۔ بی۔ کالج، بھاگلپور، بھاگلپور یونیورسٹی نے میر شمس الدین فقیر عباسی دہلوی پر تحقیق کے لئے مجھے مشورہ دیا تھا۔ میں نے فقیر دہلوی کے کلیات اور دیوان کا نادر نسخہ خدا بخش خاں لائبریری پٹنہ میں دیکھا جن میں تقریباً چار ہزار اشعار ہیں۔ ان نسخوں کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھے فقیر دہلوی پر تحقیقی مقالہ لکھنے کا مزید شوق پیدا ہوا۔ فقیر دہلوی اپنے عہد کا ایک ممتاز اور باکمال شاعر تھا لیکن نہایت افسوس کی بات ہے کہ اس کی زندگی کے حالات اور شاعری سے بیشتر لوگ بے خبر ہیں۔ مولانا شبلی جیسے نامور اہل قلم نے ہندوستان کے فارسی شعراء کے حالات زندگی قلم بند کئے لیکن فقیر دہلوی جیسی باکمال شخصیت کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ پروفیسر براؤن نے بھی فقیر دہلوی کے حالات زندگی پر روشنی نہیں ڈالی۔ اس عہد میں ہندوستان میں جو تذکرے لکھے گئے ان میں بھی فقیر دہلوی کے حالات زندگی تفصیلی طور پر نہیں ملتے ہیں۔ اس لئے راقم الحروف کو اس کے حالات زندگی کی تلاش اور جستجو میں بہت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس دور میں ایران میں بھی جو تذکرے لکھے گئے ان میں اس کے حالات زندگی بہت مختصر ملتے ہیں۔ البتہ سارے تذکروں میں "ریاض الشعراء" ہی ایک ایسا نادر تذکرہ



ہے جس میں فقیر دہلوی کے دوست علی قلی خاں والہ داغستانی نے اس کے حالات زندگی پر اچھی طرح روشنی ڈالی ہے۔ والہ داغستانی کے ذیل کے شعر سے دوستی کا اظہار ہوتا ہے ؎

دارم از فضل حبیبِ ذوالمنن — دوستی در خطۂ ہندوستان
میر شمس الدین فقیرِ دہلوی — ہست نام نامی آں مہرباں [1]

فقیر دہلوی ایک ممتاز شاعر اور باکمال صوفی تھا۔ وہ ۱۱۱۵ھ میں شاہجہاں آباد دہلی میں پیدا ہوا۔ لطف علی بیگ آذر کی ملاقات فقیر دہلوی سے ہوئی تھی۔ اس نے فقیر کی تعریف کی ہے۔

"فقیر منش و شاعری نیکو روش" [2]

خان آرزو کی ملاقات بھی فقیر سے ہوئی تھی۔ اس کا بیان ہے کہ فقیر دہلوی اپنے فضل و کمال، شاعری، انشاء، علم عروض، معانی، بیان اور بدیع میں یکتائے روزگار تھا۔ اس کی مثنویوں میں نہایت صفائی اور غزلوں میں بابا فغانی کا رنگ ہے۔ [3]

آزاد بلگرامی نے بھی فقیر دہلوی کی تعریف کی ہے۔ "در فضل و کمال و شعر و انشاء و معانی و بیان و بدیع و عروض و قوافی و زبان دانی ممتاز اقران" [4]

والہ داغستانی [5] نے لکھا ہے کہ فقیر دہلوی علم فقہ، علم کلام، حدیث اور تصوف میں بے مثال تھا۔ اس بزرگی اور فضل و کمال کی دولت کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے خاکساری سے بھی نوازا تھا یہی وجہ ہے کہ امراء اور فقراء بھی اس کی عزت کرتے تھے۔ اس کے علاوہ زہد اور پرہیزگاری میں بھی بے نظیر تھا۔

فقیر دہلوی کو اپنے وطن ہندوستان سے بھی بڑی الفت تھی اور وہ وطن سے باہر نہیں رہنا چاہتا تھا۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ اس کی وفات وطن سے باہر سمندر میں کشتی کے غرق ہونے سے ۱۱۸۲ھ میں ہوئی۔ ذیل میں اس کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں جن سے ان کی وطن دوستی کا ثبوت ملتا ہے ؎

---

۱ ریاض الشعراء ورق ۲۱۴ ۲ آتشکدہ صفحہ ۲۹۴ ۳ مجمع النفائس ۴ خزانہ عامرہ صفحہ ۳۷۵ ۵ ریاض الشعراء ورق ۲۱۴

ہندست انیس سینہ ریشاں | خاکش درمان درد کیشاں ۱؎
از ہند آفاق را جمال است | بر روی زمین بجای خال است
خوبان زمانہ را در وجاست | مجموعۂ انتخاب دنیاست
در خاک وی است گنج عرفاں | چوں در ظلمات آب حیواں
ہندست امروز مرجع فضل | ہر شہر از وست مجمع فضل
یوسف زار است خاک دہلی | مصر آمدہ سینہ چاک دہلی

فقیر دہلوی نے اورنگ زیب، فرخ سیر، محمد شاہ، احمد شاہ، عالمگیر ثانی اور شاہ عالم بادشاہ کا زمانہ دیکھا۔ شاہ عالم بادشاہ ہی کے عہد سلطنت میں فقیر دہلوی نے وفات پائی۔ اورنگ زیب کے عہد سلطنت میں فقیر دہلوی نے عہد طفولیت کی زندگی گذاری۔

محمد شاہ کو شعر و شاعری اور موسیقی سے گہرا تعلق تھا۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اس کا عہد فارسی شاعری کے عروج کا آخری دور تھا۔ اس کے بعد فارسی شعر و ادب نے بتدریج زوال کا رخ کیا اور دھیرے دھیرے فارسی شاعری کی جگہ اردو شاعری نے لے لی۔ اس زمانے میں ایسے شعراء بھی تھے جنھوں نے اردو کو اپنی شاعری کے لئے منتخب کیا۔ مثلاً سراج الدین علی خاں آرزو، نواب عمدۃ الملک امیر خاں انجام اور میر قمر الدین منت نے فارسی کے علاوہ اردو میں بھی شاعری کی۔ صاحب "تذکرۂ عشقی" نے فقیر دہلوی سے متعلق ریختہ میں ایک شعر نقل کیا ہے جسے ذیل میں پیش کیا جاتا ہے ؎ ۲؎

ترا انکھو دیکھ بلبل گل سیتی بیزار ہو جائے
اگر گل تجھ تلک پہنچے گلے کا ہار ہو جائے

فقیر دہلوی کے ہم عصر فارسی شعراء میں شیخ محمد علی حزیں، والہ داغستانی،

۱؎ والہ و سلطان ص ۷۵-۷۶ ۲؎ تذکرہ عشقی



شاہ فقیر اللہ آفریں لاہوری، قزلباش خاں امید، میر غلام علی آزاد بلگرامی اور عماد الملک غازی الدین خان تھے۔ مشتاق اصفہانی، عاشق اصفہانی، حاجی لطف علی بیگ آذر، ہاتف اصفہانی، صباحی، مجمر اصفہانی، ملک الشعراء صبا کاشانی اور سحاب اصفہانی اس عہد کے ایران کے باکمال شعراء تھے۔

میں نے اس مقالہ کو ترتیب دینے میں نہایت عرق ریزی سے کام لیا ہے جس کا اندازہ اس کے مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ بیشتر اطلاعات فارسی کے قدیم تذکروں سے میں نے یکجا کی ہیں اور والہ داغستانی چونکہ فقیر کا دوست تھا۔ اس لئے اس کے بیانات کو دوسرے تذکروں پر فوقیت دی ہے اور اس کی زندگی سے متعلق بعض اہم حالات اس کے دیوان اور کلیات سے حاصل کئے ہیں۔ فقیر دہلوی کی نامور مثنوی "والہ و سلطان" کا ایک نادر اور قدیم ترین نسخہ آقائی جعفر سلطان القرائی کے شخصی کتابخانہ تبریز میں ہے جس پر والہ داغستانی اور خدیجہ سلطان کے چند اشعار خود بخط والہ داغستانی و خدیجہ سلطان مرقوم ہیں۔ اس نسخہ کی کتابت محمد رضا نے ۱۱۶۰ھ میں دہلی میں کی تھی۔ استاد محترم ڈاکٹر عبدالغفار انصاری نے اپنے سفر ایران میں اس نسخہ کو نقل کیا اور ان صفحات کا عکس بھی حاصل کیا۔ راقم حروف نے اس نسخہ سے بھی استفادہ کیا ہے۔ میں نے خدا بخش لائبریری پٹنہ، رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، پٹنہ یونیورسٹی لائبریری، مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، رضا لائبریری رامپور، نیشنل میوزیم دہلی، لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری اور نیشنل لائبریری کلکتہ میں اس مقالہ کے لئے مواد فراہم کئے ہیں۔

میں اپنے استاد محترم ڈاکٹر عبدالغفار انصاری، ریڈر اور صدر شعبۂ فارسی ٹی۔ این۔ بی۔ کالج، بھاگلپور کا بہت شکر گذار ہوں جن کی سرپرستی اور رہنمائی نے اس مشکل کام کو انجام دیا۔ پروفیسر سید حسن، پروفیسر سید صدر الدین احمد

مرحوم، ڈاکٹر عطا کریم برق، شاہ عطاء الرحمٰن عطا کاکوی، ڈاکٹر محمد اسلم خان، ڈاکٹر حکیم الدین قریشی، عبدالقادر ہاشمی، الحاج مولانا معین الدین انچارج حبیب گنج سیکشن علیگڑھ، مولانا امتیاز علی عرشی مرحوم، الحاج بدرالہدیٰ صدیقی مرحوم و مغفور، حکیم عبدالباقی، مولانا قمرالہدیٰ ہفت قلم، ڈاکٹر فضل رب اور علی ارشد صدیقی (سابق سپرنٹنڈنٹ خدابخش لائبریری کا بھی شکر گذار ہوں کیوں کہ ان لوگوں نے مفید اور قیمتی مشورے عنایت کئے۔

آخر میں ان تمام حضرات کا شکر گذار ہوں جنھوں نے میری حوصلہ افزائی کی۔

یہ مقالہ جون ۱۹۷۷ء میں بھاگلپور یونیورسٹی میں پی ایچ۔ڈی کی ڈگری کے لئے داخل کیا گیا تھا اور فروری ۱۹۷۸ء میں اس کمترین کو پی ایچ۔ڈی کی ڈگری سے یونیورسٹی مذکورہ نے سربلند کیا۔ میں جمیع ارا کین فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی، حکومت اترپردیش کا ممنون و مشکور ہوں جن کے مالی تعاون سے یہ کتاب شائع ہوئی۔

کمترین
محمد شہاب الدین
قاضی ولی چک، بھاگلپور

۵ اگست ۱۹۸۴ء



# باب ۱

## میر شمس الدین فقیر عباسی دہلوی کے عہد میں ہندوستان کے سیاسی اور ادبی حالات

دہلی ز دست غارت افغان خراب شد
ایں جا اگر غنی طلبی جز فقیر نیست
(فقیر دہلوی)

# فقیر دہلوی کے عہد میں
# ہندوستان کے سیاسی اور ادبی حالات

فقیر دہلوی ۱۱۱۵ھ میں اورنگ زیب عالمگیر کے عہد سلطنت میں پیدا ہوا تھا اس نے اپنے بچپن کے تقریباً تین سال اس مغل بادشاہ کے دور سلطنت میں گذارے اورنگ زیب کو شعر و شاعری سے دلچسپی نہیں تھی۔ اس لئے اس نے ملک الشعراء کے عہدہ کو ختم کردیا۔ اس بادشاہ کے زمانے میں شاعری اور فنون لطیفہ کی ترقی بالکل رک گئی تھی۔ اس عہد میں فقیر دہلوی محض تین سال کا طفل تھا اس لئے اس کی شاعری کے جوہر کے عیاں ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ فرخ سیر کے عہد سلطنت میں اس نے اپنی زندگی کے تیرہ[۱۳] سال بسر کئے۔ اس بادشاہ کے دور حکومت میں بھی فارسی شعر و شاعری اور فنون لطیفہ پر زوال ہی رہا کیوں کہ بادشاہ خانہ جنگی کو سلجھانے میں الجھا ہوا تھا۔ شاعری اور فنون لطیفہ صحیح معنوں میں بے فکری اور فارغ البالی کے زمانہ میں ترقی پاتے ہیں۔ جب بادشاہ اور امراء خانہ جنگیوں کو سلجھانے میں لگے ہوں ایسی حالت میں شعر و ادب کی کیا ترقی ہوسکتی ہے۔ فرخ سیر کے بعد محمد شاہ ۱۱۳۱ھ میں ہندوستان کے تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ فقیر دہلوی اس وقت سولہ[۱۶] سال کا تھا۔ محمد شاہ نے تیس[۳۰] سال تک ہندوستان کے تخت پر سلطنت کی اور دربار میں

۱؎ سیر المتاخرین صفحہ ۳۸



شعر و شاعری کی شمع کو پھر سے روشن کیا۔ دربار میں بڑے اور چھوٹے عہدوں پر شاعر مزاج شخصیتوں کی بحالی ہوئی اور پھر سے مشاعرہ کا رواج ہوا۔ محمد شاہ خود بھی شاعر تھا اور شعراء و اہل قلم کا قدرداں تھا۔ لیکن اس کے عہد سلطنت میں فارسی شعر و ادب کا کیا حال تھا اس سے قبل اس عہد کے سیاسی حالات کا مختصر ذکر ضروری ہے۔

محمد شاہ کے عہد حکومت میں بڑے بڑے صوبے بادشاہ کے قبضہ میں برائے نام تھے کیوں کہ ہر طرف بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ سید برادران اس وقت سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ امراء و وزراء میں بے ایمانی کا جذبہ پیدا ہوگیا تھا۔ کابل سے آنے والے خزانہ سے آدھی رقم روشن الدولہ نے غصب کرلی تھی اس حرکت پر روشن الدولہ معزول کیا گیا اور اس سے غصب شدہ رقم وصول کی گئی۔ اسی زمانہ میں شاہ عبدالغفور کی خانہ تلاشی میں دو کروڑ روپئے برآمد ہوئے۔

بندیلوں کا سردار باجی راؤ مرہٹوں کی ایک طاقتور جماعت بنا کر ۱۷۳۴ء میں ہندوان پر قابض ہوگیا۔ مظفر خاں نے مرہٹوں کو وہاں سے مار بھگایا لیکن ۱۷۳۵ء میں مرہٹوں نے پھر حملہ کیا اور شہر بھر میں قتل و خون کا بازار گرم کیا۔ محمد شاہ نے باجی راؤ کی طاقت کا اندازہ کرتے ہوئے راجہ جے سنگھ کے مشورہ پر اسے مالوہ کا گورنر بنادیا حتی کہ ۱۷۳۸ء میں پورا مالوہ باجی راؤ کے تصرف میں آگیا اور پانچ لاکھ روپئے سالانا باجی راؤ کو ملنے لگے۔

نادر شاہ کا تباہ کن حملہ بھی محمد شاہ کے ہی دور حکومت میں ۱۱۵۱ھ مطابق ۱۷۳۱ء میں ہوا۔ نادر شاہ اور محمد شاہ کی فوجوں کے درمیان کرنال کے میدان میں جنگ ہوئی۔ محمد شاہ کی شکست ہوئی۔ صمصام الدولہ زخمی ہوکر پانچویں دن راہی ملک عدم ہوا۔ صمصام الدولہ کے مرنے کے بعد امیر الامراء کا عہدہ آصف جاہ کو مل گیا۔ اس وجہ سے برہان الملک بہت ناراض ہوا کیوں کہ وہ خود اس عہدہ پر فائز ہونے کا خواہاں تھا۔ اس نے نادر شاہ کو ورغلایا اور دہلی کے لال قلعہ پر قبضہ کرنے کا مشورہ

دیا۔ ۹ ذی الحجہ ۱۱۵۱ھ میں نادر شاہ لال قلعہ میں داخل ہوا۔ دوسرے روز عید الاضحیٰ تھی۔ اس دن جامع مسجد اور دوسری مسجدوں میں نادر شاہ کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ نادر شاہ کا قیام لال قلعہ میں تھا اور محمد شاہ بھی وہیں اقامت پذیر تھا۔ کسی طرح یہ افواہ پھیل گئی کہ نادر شاہ قتل کر دیا گیا۔ اس خبر کو سننے کے بعد ہندوستانیوں نے کچھ ایرانی فوجیوں کو قتل کر دیا۔ بعض مورخین نے ان کی تعداد سات سو بتائی ہے۔ اس پر نادر شاہ اتنا برہم ہوا کہ اس نے قتل عام کا حکم دے دیا۔ اس قتل عام میں بیشمار ہندوستانی مارے گئے۔ شاہی خزانہ نادر شاہ کے قبضہ میں چلا گیا۔ بعض سرداروں سے بھی رقومات اور جواہرات اس نے جبراً لئے۔ وہ ہیرے، جواہرات اور بیش قیمت سامان جنھیں وہ ہندوستان سے ایران لے گیا تھا ان کی قیمت قیاس سے باہر ہے حتیٰ کہ تخت طاؤس کو بھی وہ اپنے ہمراہ لے گیا۔ تہران کے محل "گلستان" میں ایک تخت "تخت طاؤس" کے نام سے ہے۔ شاید یہی ہندوستان کا تخت طاؤس ہے لیکن ایرانی مورخین کہتے ہیں کہ فتح علی شاہ قاچار نے اپنی بیگم کے نام پر اس تخت کو بنوایا تھا اور ہندوستان کے تخت طاؤس کے سامان بھی اس تخت طاؤس میں لگائے گئے ہیں۔

نادر شاہ کے جانے کے بعد مرہٹوں کی بغاوت پھر شروع ہو گئی۔ لیکن وہ شکست کھا کر ناگپور کی طرف چلے گئے۔ ۱۷۴۸ء میں احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر فوج کشی کی لیکن اس نے شکست کھائی اور اپنے سپاہیوں کے ساتھ افغانستان کی جانب رہ سپار ہوا۔ اس حملہ نے ہندوستان کو اور بھی کمزور کر دیا۔ یہاں کی رعایا ہر وقت بیرونی فوج کشی کے خیال سے ہراساں رہنے لگی۔ فقیر دہلوی نے احمد شاہ ابدالی کے حملہ کو شہر دہلی میں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ذیل کے اس کے شعر سے یہ بات واضح ہوتی ہے ؎

دہلی زدست غارت افغاں خراب شد
ایں جا اگر غنی طلبی جز فقیر نیست [۱]

[۱] دیوان فقیر قلمی۔ خدا بخش



۲۹ اپریل ۱۷۴۸ء میں محمد شاہ کا انتقال ہوا۔ ۲۹ اپریل ۱۷۴۸ء میں شالامار باغ، لاہور میں اس کے بیٹے احمد شاہ کی رسم تخت نشینی ہوئی لیکن اپنی نا اہلی کے سبب وہ ہمیشہ دوسروں کے اشارے پر چلتا رہا۔ بڑے بڑے سردار بغاوت پر آمادہ تھے اور اعلیٰ منصبوں اور عہدوں کو صاحب اقتدار سرداروں نے بادشاہ کی اجازت کے بغیر آپس میں تقسیم کر لیا تھا۔ فقیر دہلوی اس وقت زندہ تھا اور لباس فقر اختیار کر چکا تھا۔ اس کو کسی چیز کی پرواہ نہ تھی۔ صفدر جنگ کو وزارت ملی۔ افغانیوں کی طاقت بھی روز بروز بڑھ رہی تھی۔ افغانیوں کے سردار احمد خان اور صفدر جنگ کی فوجوں کے درمیان لڑائی ہوئی اور صفدر جنگ کو شکست کا منھ دیکھنا پڑا۔ افغانیوں کی روز افزوں طاقت صفدر جنگ کے لئے ایک مصیبت بن گئی۔ ان کی طاقت کو ختم کرنے کے لئے صفدر جنگ نے مرہٹوں اور جاٹوں سے دوستی کی اور ان کے ساتھ افغانوں سے نبرد آزمائی کے لئے فرخ آباد گیا۔ فرخ آباد مرہٹوں کے ہاتھوں بری طرح تباہ ہوا اور افغانوں کو شکست فاش ہوئی۔

احمد شاہ ابدالی ۱۷۵۱ء میں دوبارہ ہندوستان پر حملہ کرنے کے ارادہ سے آیا۔ صفدر جنگ وزیر اعظم دہلی میں موجود نہیں تھا۔ بزدل بادشاہ نے احمد شاہ ابدالی کو ملتان اور پنجاب دے کر صلح کر لی۔ جب صفدر جنگ واپس آیا اور اس کو اس صلح کا حال معلوم ہوا تو اس نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ بادشاہ نے اس کی ایک نہیں سنی اس لئے صفدر جنگ اور بادشاہ میں عداوت ہو گئی۔ حتیٰ کہ ۱۷۵۳ء میں دونوں کے درمیان خانہ جنگی کا سلسلہ شروع ہوا جو چھ ماہ تک جاری رہا۔ آخر کار دونوں میں صلح ہو گئی۔ احمد شاہ ایک بزدل، نالائق، کمزور، پریشان دل اور بدنصیب بادشاہ تھا تقریباً چھ سال حکومت کرنے کے بعد عماد الملک نے اس کو بادشاہت سے برطرف کر دیا اور اسی دن شہزادہ عزیز الدین بن جہاندار شاہ کو اس نے عالمگیر ثانی کے لقب سے تخت نشین

کیا۔ معزول احمد شاہ اور اس کی والدہ کو مقید کیا گیا۔ معزولی کے ایک ہفتہ بعد
دونوں کی آنکھیں ضائع کر دی گئیں۔

عوام میں روز بروز بے چینی بڑھتی گئی۔ ۱۷۵۷ء میں احمد شاہ ابدالی لاہور
ہوتا ہوا دہلی پہنچا اور شہر پر اسی روز اس کا قبضہ ہو گیا۔ ایک ماہ تک وہ دہلی میں
رہا۔ جاٹوں کے قلعہ بلبھ گڑھ کو اس نے تین دن میں فتح کیا۔ احمد شاہ ابدالی
کی دہلی سے واپسی کے بعد مرہٹوں نے دہلی آکر عالمگیر ثانی کے قلعہ کا محاصرہ کر
لیا۔ بادشاہ کو مرہٹوں نے ڈیڑھ ماہ تک محصور رکھا۔ ان کا حملہ بنگال اور
اڑیسہ پر بھی ہوا۔ مرہٹوں نے کٹک اور مرشد آباد کو اپنے تسلط میں کر لیا۔ لیکن علی وردی
خان نے بردوان کے قریب ان مرہٹوں کو شکست دے کر مدنا پور تک بھگا دیا۔
عالمگیر ثانی کوٹلہ فیروز شاہ میں ۸ ربیع الآخر ۱۱۷۳ھ مطابق ۱۷۵۹ء میں مقتول
ہوا۔ شاہ عالم ثانی کی رسم تاجپوشی ۴ جمادی الاول ۱۱۷۳ھ میں عظیم آباد (پٹنہ) میں
ہوئی کیوں کہ وہ اسی علاقہ میں تھا۔ اس نے گرچہ چھیالیس سال تک حکومت کی لیکن اس
کے عہد سلطنت میں ہندوستان کی رہی سہی طاقت بھی ختم ہو گئی۔ امراء کے درمیان
نفاق اور کشیدگی میں مزید اضافہ ہوا اور مرہٹوں اور جاٹوں نے بھی ہر طرح سے
ملک کو کھوکھلا بنا دیا۔ اورنگ زیب نے اپنی وفات کے زمانہ میں اپنی اولاد کو نصیحت
کی تھی کہ وہ لوگ سلطنت کو تین حصوں میں منقسم کر لیں کیوں کہ ہندوستان کے
ہر صوبہ میں خود مختاری کا زور بڑھ رہا تھا اس لئے ان باغیوں کی ایک جگہ سے
گوشمالی ممکن نہیں تھی۔ لیکن اگر تین طرف سے ان کی گوشمالی ہوتی تو ان کی طاقتیں
ضرور کچلی جاتیں۔ لیکن اورنگ زیب کی اولاد نے اپنے والد کے مشورے پر
عمل نہیں کیا کیوں کہ ان میں اس سیاست کو سمجھنے کی عقل نہیں تھی۔ آہستہ
آہستہ مغلیہ حکومت کو گھن لگتا گیا اور جو حکومت کشمیر سے دکن تک، بنگال سے
کابل اور قندھار تک پھیلی ہوئی تھی وہ دہلی کے لال قلعہ میں مقید ہو گئی۔ ہندوستان



کے مختلف صوبہ داروں نے بادشاہ کی قوت کو کمزور دیکھتے ہوئے خود مختاری کا اعلان
کر دیا۔ اودھ اور دکن بھی ہاتھ سے نکل گئے۔ یہ دیکھ کر مرہٹوں، جاٹوں اور
سکھوں نے بھی بغاوت کی۔ اس موقع پر انگریزوں کو بھی ہندوستان میں تجارت
کے بہانے اپنی طاقت کو مضبوط کرنے کا موقع ملا۔ شاہ عالم ثانی ہی کے عہد سلطنت
میں فقیر دہلوی ۱۱۸۳ھ مطابق ۱۷۶۹ء میں دریائے شور میں غرقاب ہوا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

مغلیہ سلطنت پر تنزلی کے آثار محمد شاہ کے زمانہ سے قبل ہی نمودار ہو چکے
تھے۔ نادر شاہی اور احمد شاہی حملوں نے مغلیہ حکومت کو بری طرح نقصان پہنچایا
لوگوں کے معاشی حالات بد سے بدتر ہوتے ہو گئے۔ امراء اور سردار آپس میں
لڑتے تھے۔ بیرونی حملوں کا ہر وقت خطرہ تھا۔ ایسے پر آشوب دور میں شعر و ادب
کی ترقی ممکن نہیں تھی کیوں کہ ہر طرف بدامنی اور بے اطمینانی کے بادل چھائے
ہوئے تھے۔ ان حالات میں بھی شعراء اور اہل قلم نے شعر و ادب کی حتی الامکان
خدمت کی۔ محمد شاہ نے شعراء اور اہل علم کی سرپرستی کی اور خود بھی اردو میں
اشعار کہے۔ اس دور کے فارسی شعراء میں مرزا زاہد علی سخا، خواجہ محمد عاصم
حشمت اصفہانی، جوگل کشور ثروت، جے نارائن، مرزا امام قلی، بندرابن داس
خوشگو، شیر افگن خاں باسطی، احمد یار خاں یکتا، شیخ حزیں، گلشن علی
جونپوری، قزلباش خاں امید، ملا علی اکبر سودا قمی، غیرت خان بہادر غیرت، حکیم
حسین خان شہرت، مرشد قلی خاں، علی قلی خاں والہ داغستانی، میر شمس الدین فقیر
عباسی دہلوی، شاہ فقیر اللہ آفریں لاہوری، امیر خان انجام، حاکم لاہوری، بھگوان داس
ہندی، بیدل، مرتضیٰ قلی خاں فراق، سراج الدین علی خاں آرزو، میر عبد الجلیل
بلگرامی، لچھمی نرائن شفیق، حاجی لطف علی بیگ آذر وغیرہ کے نام زبان زد خاص و
عام ہیں۔ محمد شاہ نے شعراء کی سرپرستی میں حوصلۂ شاہانہ سے کام لیا۔ شیخ حزیں

کو چالیس ہزار روپے سالانہ کی جاگیر دی تھی۔ یہ بھی مشہور ہے کہ محمد شاہ نے حزیں کو وزیر بنانا چاہا تھا لیکن حزیں نے قبول نہیں کیا۔[1] اسی طرح محمد شاہ نے حکیم علوی خاں کو شش ہزاری اور غیرت خاں بہادر غیرت کو پنج ہزاری منصب پر فائز کیا تھا۔ اس کے علاوہ کئی شعراء کو اس نے اپنے دربار میں بڑے بڑے عہدے عطا کئے تھے۔ مرشد قلی خاں کو اس نے اڑیسہ کا ناظم مقرر کیا تھا۔ حکیم حسین شہرت کو حکیم الممالک کا خطاب دیا تھا۔ مرزا لطف اللہ نثار کو توپ خانہ کا داروغہ بنایا تھا۔ اسی طرح اس نے بہت سے شعراء اور اہل قلم کو اعلیٰ مناصب و داد و دہش سے نوازا تھا۔ یہ اس کی علم دوستی کا ثبوت ہے۔

محمد شاہ کے بعد احمد شاہ، عالمگیر ثانی اور شاہ عالم ثانی بادشاہ کے دور سلطنت میں فارسی شعر و ادب کو اور بھی برا وقت دیکھنا پڑا کیوں کہ اس زمانے میں لوگ پریشانیوں میں مبتلا تھے اور دربار کی رونق تقریباً ختم ہو گئی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ محمد شاہ کا زمانہ فارسی شاعری اور فنون لطیفہ کا آخری دور تھا۔ احمد شاہ، عالمگیر ثانی اور شاہ عالم بادشاہ کے دور سلطنت میں فارسی شعر و شاعری کی ترقی نہ ہو سکی بلکہ انحطاط ہی رہا۔ اس عہد میں بادشاہ اندرونی اور بیرونی حملوں سے بہت پریشان تھے۔ عالمگیر ثانی کو مقتول ہونا پڑا اور شاہ عالم ثانی کو بھی اطمینان کے ساتھ حکومت کرنے کا موقع نہیں ملا۔ شاہ عالم ثانی خود بھی فارسی اور اردو کا شاعر تھا اور آفتاب تخلص کرتا تھا۔ اس کا فارسی دیوان برٹش میوزیم لندن میں ہے۔ اس کے اردو دیوان کا ایک نسخہ موتی محل لائبریری میں تھا جو اب ناپید ہے۔ اسپرنگر نے اس لائبریری کا کٹلاگ بنایا تھا۔

میر شمس الدین فقیر عباسی دہلوی اپنے عہد کا ایک ممتاز اور باکمال فارسی شاعر تھا۔ سراج الدین علی خان آرزو اور دیگر نقادوں نے بھی اس کی شاعری کی تعریف کی ہے۔ بعض ناقد نے تو یہ کہا ہے کہ اس عہد میں اس کے مثل ہندوستان میں کوئی نہیں تھا؎

لذت قند مکرر می دہد شعر فقیر

[1] سیر المتاخرین



# باب ۲

## میر شمس الدین فقیر دہلوی تواریخ، تذکرے اور سوانح کی روشنی میں

دل من بحر معنی است فقیر
از سخن گوہر ثمین دارم
(فقیر دہلوی)

# فقیر دہلوی تواریخ تذکرہ اور سوانح کی روشنی میں

(۱) علی قلی خان واله داغستانی ـــــــ ریاض الشعراء (سال تکمیل ۱۱۶۱ھ)

میر شمس الدین فقیر دہلوی — ہست نام نامی آن مہربان
نکتہ سنجی کہ بود بے اشتباہ — عاجز از تعریف و توصیفش زبان

"میر شمس الدین فقیر عباسی دہلوی..........افاضل زمان و اسوۂ سخنوران جہانست..........در خدمت علماء عصر تحصیل مراتب علم نمودہ، در عربیت و فقہ و کلام و حدیث و تصوف عجوبۂ زمان و نادرۂ دوران با این ہمہ مراتب فضل و حکمت در نہایت بی تکلفی و بی تعیشی با قاطبۂ خلق سلوک می نماید بلکہ بطرزی حال خود را از مردم پوشیدہ می دارد کہ بیگانگان را گمان سوادہ رسی با و نمی رود تا بمراتب دیگر چہ رسد۔"

(۲) میر غلام علی آزاد بلگرامی ـــــــ خزانۂ عامرہ (۱۱۷۶ھ)

"میر شمس الدین دہلوی سلمہ اللہ تعالیٰ ہر چند فقیر تخلص می کند اما باعتبار سرمایۂ استعداد خداداد از اغنیاء زمان است و در فضل و کمال و شعر و انشاء و معانی و بیان و بدیع و عروض و قوافی و زبان دانی ممتاز اقران۔"



(۳) حاجی لطف علی بیگ آذر ـــــــ آتشکدہ (در حدود ۱۱۷۴ - ۱۱۹۳ھ)

"میر شمس الدین محمد فاضلی فقیر منش و شاعری نیکو روش..........
آخر بہ لباس فقر ملتبس گشتہ ملاقات او اتفاق افتاد۔"

(۴) بھگوان داس ہندی ـــــــ سفینۂ ہندی۔ تالیف ۱۲۱۹ھ

"بعد رسیدن بہ سن تمیز بہ تحصیل علوم پرداختہ در اندک زمانی اعجوبۂ زمان و ناقد دوران شد در فقہ و کلام و حدیث و تصوف خصوصاً در شعر و انشاء و عروض و قافیہ و معانی و بیان و بدیع مہارت کلی داشت....
..........ہمہ کلامش نغز است و سراپا مغز۔"

(۵) لچھمی نراین شفیق اورنگ آبادی ـــــــ گل رعنا (۱۱۸۱ - ۱۱۸۲)

"جناب آزاد مد ظلہ العالی سلسلۂ نسب او را از خودش استفسار فرمودند۔ این عبارت بخط خود نوشتہ داد سلسلۂ نسب فقیر بشاہ محمد خیالی قدس سرہ الدین بندگی حسن ابن طاہر میرسد ہم از طرف والد و ہم از طرف والدہ۔ شیخ عبد العزیز دہلوی برادر کوچک شاہ محمد خیالی قدس سرہ و تربیت کردۂ ایشانند، مگر این کہ والد ایشان صبیۂ شیخ عیسیٰ تاج جونپوری جد کلاں شیخ غلام غوث بودہ و والدہ جد فقیر صبیۂ شیخ براہی حقانی مہاری بودہ و سلسلۂ نسب شاہ محمد خیالی از جانب والد بوساطت المتقی باللہ و دیگر خلفائے جابریہ عباس بن عبد المطلب رضی میرسد انتہیٰ۔ احوال شیخ حسن طاہر و شیخ عبد العزیز مستقل در اخبار الاخیار شیخ عبد الحق دہلوی مسطور است
..........عمدۂ شعراء حال است و سرآمد ارباب کمال در عہد ماضی۔"

(۶) سراج الدین علی خاں آرزو ـــــــ مجمع النفائس (۱۱۶۴ھ)

"خداش سلامت دارد کہ امروز مثل او در ہند نیست ........

.......در فضل وکمال وشعر وانشاء وفنون دیگر مثل عروض وقافیہ و
معانی وبیان وبدیع یکتائے روزگار ومنتخب لیل ونہار است"

(۷) میر شمس الدین فقیر دہلوی (بزبان خود) دیوان فقیر دہلوی، خدا بخش لائبریری پٹنہ

شد رتبۂ فقیر بلند از فروتنی — نشود نماز خاک نشینی است دانہ را

---

لذت قند مکرر می دہد شعر فقیر — تازبانش وقف مدح حیدر کرار شد

---

دل من بحر معنی است فقیر — از سخن گوہر ثمین دارم

(۸) عبد الحکیم حاکم لاہوری — مردم دیدہ (۱۱۷۵ھ)

"الحق دریں وقت بی ہمتاست وصاحب کمال"

(۹) غلام ہمدانی مصحفی ——— عقد ثریا (۱۱۹۹ھ)

"مرد بزرگ وصاحب کمال بود" بجمیع فنون فضائل وکمالات
سہیم وعدیل بداشت۔

(۱۰) علی احمد خان ہاشمی سندیلوی ——— مخزن الغرائب (۱۲۱۸ھ)

"آبای کرامش صاحب فضل ورؤسای دہلی بودہ اند در فضل و
کمال میر شمس الدین شکی نبودہ ودر علم شعر نیک ماہر..........
در انشاء وعروض وقافیہ ومعانی وبیان وبدیع یکتائے روزگار بودہ"

(۱۱) حسین قلی خان عاشقی عظیم آبادی ——— نشتر عشق (۱۲۲۴ـ۱۲۳۳)

از فاضلان عصر خود تحصیل مراتب علمیہ نمودہ استعداد کثیرہ و
سرمایۂ وافرہ پیدا خاست وزباندانی وخوش لسانی برتبہ رسانیدہ
کہ اہل عجم از وی حساب برمیداشتند ووی را از گروہ فصحا می انگاشتند۔



(۱۲) محمد قدرت اللہ گوپاموی — نتائج الافکار (۱۲۵۷)

"گنجینۂ فنون دلپذیر شمس الدین فقیر.........پیکر لطیفش
.........وی از اعیان آن دیار خلد آثار است بخدمت علمای
وقت بہ کسب کمالات گرائیدہ از ذہن نقاد استعداد شائستہ
ودستگاہ بائستہ بہم رسانیدہ در فنون نظم ونثر ومعانی وبیان و
بدیع وعروض وقوافی از منتخبین روزگار گردید"۔

(۱۳) رضا قلی خان ہدایت — تذکرہ ریاض العارفین (تقریباً ۱۲۸۱ـ۱۲۸۲ھ)

تحصیل مراتب در شاہجہان آباد کردہ در فقہ وکلام وحدیث
علمی در خدمت علماء صاحب مایہ وبلند پایہ وجود فضائل طالب
خدمت درویشاں وغالب اوقات در صحبت ایشاں آخر الامر از
برکت معاشرت ایشاں بہ ترک علایق وعوایق دنیوی گفتہ وظاہراً
وباطناً طریق طریقت پذیرفتہ ملبس بہ لباس فقر شدہ سیاحت
نمودہ ودرجات عالیہ حاصل فرمود۔

(۱۴) صدیق حسین خان — شمع انجمن (۱۲۹۲ھ)

"اما باعتبار سرمایۂ استعداد خداداد از اغنیاء زمان بود
ودر انشاء وشعر وعلم معانی وبیان وجز آن از فنون فضل وکمال
وزباندانی فارسی ممتاز اقران می زیست"

(۱۵) عبد المقتدر ـ سابق کٹلاگر خدا بخش لائبریری پٹنہ

"..........was one of the most
accomplished Persian scholars of
India"

# باب ۳

## شرح احوال میر شمس الدین فقیرؔ دہلوی

مفلسم لیک دلم را ہوس زر خود نیست
چشم من آبلۂ دست تو گوہر خود نیست

(فقیرؔ دہلوی)

## میر شمس الدین فقیرؔ عباسی دہلوی

نام :۔ خان آرزوؔ[1]، والہ داغستانی[2]، گلشن علی جونپوری[3]، بھگوان داس[4] ہندی اور علی احمد[5] خان ہاشمی سندیلوی نے اس کا نام میر شمس الدین اور تخلص فقیرؔ لکھا ہے۔ والہ داغستانی کے ایک شعر سے بھی واضح ہوتا ہے کہ اس کا نام میر شمس الدین تھا۔ ذیل میں وہ شعر نقل کیا جاتا ہے۔

میر شمس الدین فقیرؔ دہلوی
ہست نام نامی آن مہربان[6]

لیکن حاجی لطف علی بیگ آذرؔ نے میر شمس الدین محمد لکھا ہے ذیل میں ملاحظہ ہو۔

"میر شمس الدین محمد فاضل فقیر منش وشاعری نیکو روش۔"[7]

مذکورہ بالا تذکروں میں سب سے قدیم تذکرہ ریاض الشعراء ہے جسے والہ داغستانی نے ۱۱۶۱ھ میں پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ والہ داغستانی میر شمس الدین فقیرؔ کا دوست بھی تھا اس لئے اس کا بیان سب سے زیادہ معتبر ہے۔ اور ریاض الشعراء فقیرؔ دہلوی

---

۱؎ بحوالہ مردم دیدہ ص ۸۲ ۔ ۲؎ ۳؎ ریاض الشعراء ورق ۳۱۴-۳۷۶ ۔ ۴؎ بحوالہ گل رعنا ورق ۲۱۲ ۔ ۵؎ سفینۂ ہندی ص ۱۵۲ ۔ ۶؎ مخزن الغرائب اول ص ۳۷۵ ۔ ۷؎ آتشکدہ مطبوعہ ص ۳۹۴ چھاپ بمبئی۔

کی زندگی ہی میں تالیف ہوئی یہ بھی ایک اہم بات ہے اس لئے اس کی صداقت میں شبہ نہیں اور دوسرے تذکروں پر اس کو فوقیت حاصل ہے۔ دوسرا قدیم تذکرہ مجمع النفائس ہے۔ جسے سراج الدین علی خاں آرزو نے ۱۱۶۴ھ میں لکھا جبکہ فقیر دہلوی زندہ تھا اور دونوں کے درمیان اچھے تعلقات بھی تھے۔ اس لئے یہ بھی فقیر کے حالات زندگی کے لئے ایک اہم تذکرہ ہے۔ حاکم لاہوری اور فقیر دہلوی کے درمیان بھی اچھے تعلقات تھے۔ حاکم لاہوری نے ۱۱۷۵ھ میں "مردم دیدہ" لکھا چونکہ یہ بھی ایک ایسا تذکرہ ہے جو فقیر دہلوی کی زندگی میں لکھا گیا ہے اس لئے اس تذکرہ کی بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ۱۱۷۶ھ میں آزاد بلگرامی نے "خزانۂ عامرہ" تالیف کیا اور اس وقت فقیر تھا۔ اس لئے اس تذکرہ کے بیانات بھی اہم ہیں۔ حاجی لطف علی بیگ آذر کی ملاقات فقیر دہلوی سے ہوئی تھی اور آذر نے اپنے تذکرہ "آتش کدہ" میں فقیر دہلوی کا ذکر کیا ہے۔ اس لئے یہ تذکرہ بھی قابل قدر تذکرہ ہے۔ بھگوان داس ہندی کی ملاقات بھی فقیر دہلوی سے ہوئی تھی اس وجہ سے بھگوان داس ہندی نے فقیر کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ اہم ہے۔

بھگوان داس ہندی، خان آرزو، اور قدرت اللہ نے لکھا ہے کہ فقیر دہلوی کا نسب نامہ حضرت عباس تک پہنچتا ہے اور والدہ کی طرف سے وہ سید تھا۔ والہ داغستانی، آزاد بلگرامی اور مصحفی کا بیان ہے کہ وہ عباسی تھے۔ ذیل میں والہ داغستانی کا بیان نقل کیا جاتا ہے۔

"میر شمس الدین فقیر عباسی دہلوی حفظہ اللہ قدسہ[1] افاضل

---

[1] ریاض الشعراء ورق ۳۱۴



زمان و اسوہ سخنوران جہانست"۔

حسین قلی خان کی رائے ذیل میں قلمبند کی جاتی ہے۔

فقیر میر شمس الدین از بزرگ زادہ ہائے دار الخلافت شاہجہاں آباد است از جانب پدر قوم عباسی بود و از طرف مادری سیادت نسب از احفاد شاہ اعظم خانی است[1] صاحب سفینہ ہندی کا بیان ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

"نسبش از جانب پدر بحضرت عباسؓ می رسد و از طرف مادر بخاندان نبوت می پیوندد[2]"

آزاد بلگرامی کا بیان ذیل میں ملاحظہ ہو۔

"و سلسلہ نسب او از جانب پدر بہ عباسؓ عم النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و از جانب مادر بہ سادات می رسد۔ لہذا نام او مصدر بہ میر است[3]"

صاحب تذکرہ "گل رعنا" کا بیان پیش کیا جاتا ہے۔

"جناب آزاد مدظلہ العالی سلسلہ نسب او را از خودش استفسار فرمودند۔ ایں عبارت بخط خود نوشتہ داد سلسلۂ نسب فقیر بشاہ محمد خیالی قدس سرہ الہ دین بندگی حسن ابن طاہر می رسد ہم از طرف والد و ہم از طرف والدہ شیخ عبدالعزیز دہلوی برادر کوچک شاہ محمد خیالی قدس سرہٗ و تربیت کردۂ ایشانند مگر ایں کہ والدہ ایشاں صبیۂ شیخ عیسی برای حقانی مہاری بودہ سلسلۂ نسب شاہ محمد خیالی از جانب والد بوساطت

---

[1] نشتر عشق [2] سفینہ ہندی ص ۱۵۲-۱۵۳ [3] خزانہ عامرہ ص ۲۸۴

المتقی باللہ و دیگر خلفائے بنا بر بہ عباس بن محمد المطلب
میرسد انتہی"۔

احوال شیخ طاہر و شیخ عبدالعزیز مستقل ودر اخبار الاخیار
شیخ عبدالحق دہلوی مسطور است۔[1]

ابوطالب اصفہانی کا بیان ذیل بہ تمام مرقوم ہے۔

"میر شمس الدین دہلوی المتخلص بہ فقیر از عباسیہ ہند
وا فاضل درویش مسلک و پرہیزگار و دانشمند است۔[2]

مذہب۔ مختلف تذکروں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ فقیر
دہلوی عباسی تھا۔ اس کا دوسرا والہ داغستانی بھی عباسی تھا اس
لیے دونوں کے درمیان ہم نسب ہونے کی وجہ سے بہت گہرے
تعلقات تھے۔ فقیر دہلوی کے دیوان میں حضرت علیؑ کی مدح میں جا بجا
اشعار ملتے ہیں۔ ذیل میں حضرت علیؑ کی مدح میں فقیر کے چند اشعار نقل
کیے جاتے ہیں۔

طلب کن ہر چہ خواہی از علی مرتضیٰ اے دل
فقیر خویش را می بخشد آں شہ دین و دنیا ہم
فقیر از جہل عمری بت پرستی معنوی بودم
علی را من از آں روزے کہ دانستم خدا دانم

حضرت علی کی مدح میں فقیر دہلوی کی ایک غزل مسلسل نقل کیجاتی ہے

از مہر علی یافت فروغ ایں گہر دل  صد جان گرامیست بقربان سر دل[3]
اے آنکہ طلبگار کشود دل خویشی  بی حب علی وا نشود قفل در دل

---

[1] گل رعنا۔ ص ۲۲۶ [2] خلاصۃ الافکار۔ ص ۱۴۱ [3] دیوان فقیر خدا بخش۔



ہر موی زبانی است بہ ذکر شہ مردا  از بس بہ تنم کردہ سرایت اثر دل
تا چشم دلم روشنی از مہر علی یافت  حقا کہ فتادہ است دو کون از نظر دل
خواہی کہ دل گم شدۂ خویش بیابی  در عشق در آویز کہ گوید خبر دل
گر دیدۂ بینا بتو بخشند بہ بینی  کاتشکدۂ ہست نہاں در شرر دل
مفتون[1] ہوس میوۂ فردوس ندارد
از مہر شہنشاہ رسیدش ثمر دل

ذیل میں نجف اور شاہ نجف (حضرت علیؑ) کی مدح میں فقیر کی ایک
غزل مسلسل لکھی جاتی ہے

بود ز خون قبلہ نما چشم من براہ نجف  قسم بہ سرمۂ خاک حریم شاہ نجف
ز تو از [illegible] گشتہ است دامنگیر  گل بہشت نخواہم بخار راہ نجف
[illegible] دیگر گریز گاہی نیست  تواں کشید دلا رخت خود بہ شاہ نجف
بہ جستجوی خضر کی روم ز راہ فقیر
صلای عمر ابد میزند گیاہ نجف

فقیر کی مثنوی "شمس الضحیٰ" میں بھی حضرت علی کی مدح میں ایک
مثنوی ہے۔ ذیل میں حضرت علی کی منقبت میں جو مثنوی ہے اس سے
دو شعر نقل کیے جاتے ہیں۔

آں علی یار [illegible]  آں کہ ما را او دوست چشم نظر
آں نمائندہ رہ ایماں  آں کشائندۂ در عرفاں[2]

مندرجہ بالا اشعار اور شواہد سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ فقیر
دہلوی شیعہ تھا۔

---

[1] فقیر دہلوی کا تخلص پہلا مفتون تھا جیسا کہ تذکروں سے معلوم ہوا ہے [2] دیوان فقیر خدا بخش [3] مثنوی شمس الضحیٰ ورق ۱۳۱۔

**اوائل زندگی اور تعلیم:-** راقم حروف نے فقیر دہلوی کے دوستوں کے نوشتہ تذکروں کا بھی مطالعہ کیا۔ اس کے علاوہ اس دور کے سارے تذکروں کو دیکھا لیکن کسی تذکرہ نگار نے فقیر دہلوی کے والدین کے نام اور حالات زندگی نہیں لکھے۔ اسکے دوست واله داغستانی نے بھی اس کے والدین کا نام نہیں بتایا صرف حسین قلی اور صدیق حسن خان نے اس پر کچھ روشنی ڈالی ہے لیکن اس کے والدین کا نام نہیں بتایا ہے۔ حسین قلی خان کا بیان ہے کہ فقیر دہلوی کی والدہ کا سلسلۂ نسب شاہ اعظم خانی سے تعلق رکھتا ہے لیکن بہت افسوس کی بات ہے کہ اس کے والدین کا نام باوجود انتہائی جستجو کے نہ مل سکا۔ حسین قلی خان کا بیان نقل کیا جاتا ہے۔

"از جانب پدر قوم عباسی بود و از طرف مادری سیادت نسب
از احفاد شاہ اعظم خانی است[1]"

صدیق حسن خان نے لکھا ہے

"فقیر میر شمس الدین عباسی دہلوی از اولاد شاہ محمد خیالی بود[2]"

لچھمی نرائن شفیق نے لکھا ہے کہ آزاد بلگرامی نے اپنا تذکرہ لکھتے وقت فقیر دہلوی سے خط لکھکر اسکے حالات زندگی دریافت کیا تھا۔ فقیر دہلوی نے خود اپنے حالات زندگی لکھ کر آزاد بلگرامی کو بھیجا تھا جس کے مطابق فقیر دہلوی کا خاندانی سلسلہ والد کی طرف سے شاہ محمد خیالی قدس سرہ سے اور والدہ کی طرف سے شیخ عبدالعزیز دہلوی (شاہ محمد خیالی قدس سرہ کے چھوٹے بھائی) سے جا ملتا ہے۔ ذیل میں لچھمی نرائن شفیق کا بیان مرقوم ہے۔

"جناب آزاد مدظلہ العالی سلسلہ نسب او را از خودش استفسار

---

[1] نشتر عشق، خدا بخش [2] شمع انجمن ص ۳۷۸، ۳۷۹۔



فرمودند این عبارت بخط خود نوشتہ داد سلسلہ نسب فقیر بہ شاہ محمد خیالی قدس سرہ الہ این بندگی حسن ابن طاہری رسد ہم از طرف والد و ہم از طرف والدہ شیخ عبدالعزیز دہلوی برادر کوچک محمد خیالی قدس سرہ و تربیت کردۂ ایشانند مگر این کہ والد ایشان صبیۂ شیخ عیسیٰ تاج جونپوری جد کلاں شیخ غلام غوث بودہ و والدہ جد فقیر صبیہ شیخ براتی حقانی مہاری بودہ سلسلۂ نسب شاہ محمد خیالی از جانب والد بو ساطت المتقی باللہ و دیگر خلفائے جابر بن عباس بن عبدالمطلب می رسد انتہی احوال شیخ طاہر و شیخ عبدالعزیز مستقل در اخبار الاخیار شیخ عبدالحق دہلوی مسطور است[1]"

آزاد بلگرامی نے بلاشبہ اپنے تذکرہ "خزانہ عامرہ" کی تالیف کے وقت فقیر دہلوی کو خط لکھا تھا اور اس کے حالات زندگی طلب کیا تھا۔ اس خط میں یہ بھی درج تھا کہ "سرو آزاد" میں فقیر دہلوی کا ذکر اس لئے نہ ہو سکا کہ اس کی زندگی کے حالات دستیاب نہ تھے۔

۱۹ شعبان ۱۱۷۲ھ میں فقیر دہلوی کا خط حالات زندگی اور اشعار کے ساتھ آزاد بلگرامی کو ملا اس بیان سے لچھمی نرائن شفیق کا متذکرہ بالا بیان بھی صحیح ہوتا ہے کیونکہ اس نے بھی آزاد بلگرامی کے خط کا ذکر کیا ہے۔ ذیل میں آزاد بلگرامی کی تحریر نقل کی جاتی ہے۔

"فقیر درایام ...... مکتوبی ...... قدری ...... بر سبیل فرستادم و نوشتم کہ وقت تالیف "سرو آزاد" بر احوال سامی اطلاع دست نداد لہذا جای شریف دراں کتاب خالی ماند الحال تمنا

---

[1] خزانہ عامرہ ص ۳۸۴۔

واشعار خود با و فرستاد کہ در خزانہ عامرہ تدارک بعمل آید جواب میر محرر نوزدہم شعبان سال حال با قدری اشعار وصول مسرت شمول نمود

فقیر دہلوی ایک نہایت معزز اور شریف خاندان کا فرد تھا کیونکہ مختلف تذکروں سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ اس کا خاندانی سلسلہ شاہ محمد خیالی قدس سرہ، شیخ عبدالعزیز دہلوی قدس سرہ، شیخ عیسیٰ تاج جونپوری، شیخ غلام غوث اور حضرت عباسؓ سے جا ملتا ہے۔ فقیر دہلوی کا تعلق چونکہ اس عہد کے ہندوستان کے بڑے نامور خاندان سے ہے اس لئے اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی پرورش اور تربیت نہایت ناز و نعم کے ساتھ ہوئی ہوگی لیکن یقینی طور پر یہ بات نہیں کہی جا سکتی ہے کہ اسکا بچپن عیش و عشرت میں گذرا ہوگا بہت ممکن ہے کہ زمانہ کی نیرنگیوں کی وجہ سے تنگ دستی رہی ہو لیکن اس بات کا امکان کم ہے۔ فقیر دہلوی کا بچپن اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں گذرا۔

فقیر دہلوی کی تعلیمی زندگی کا حال پردۂ خفا میں ہے۔ راقم حروف مختلف تذکروں اور اس کے دیوان کا مطالعہ کیا تاکہ اس کے استادوں کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکے لیکن افسوس کی بات ہے کہ اسکے کسی استاد کا نام معلوم نہ ہو سکا لیکن چونکہ اسکا خاندان علم و فضل میں درجہ کمال پر تھا اور شیخ عبدالعزیز دہلوی جیسے صاحب علم و معرفت بزرگوں کے خاندان سے تھا اس لئے یہ بات قرین قیاس ہے کہ اس کی تعلیم و تربیت اس زمانہ کے نامور اور ممتاز استادوں سے ہوئی ہوگی دوسری بات یہ ہے کہ اگر اس کی تعلیم اس عہد کے نامور اور صاحب کمال استادوں سے نہیں ہوئی تو پھر وہ کس طرح علم و فضل میں باکمال ہوا ظاہر ہے اس نے تحصیل علم کے ذریعہ خود کو اس لائق بنایا کہ اسکی زندگی میں ہی جو تذکرے لکھے گئے ان میں بھی اس کے علم و فضل کی بہت



تعریف مرقوم ہے۔ مثلاً اس کے دوست والہ داغستانی کی زبان سے اس کے علم و کمال کی تعریف ملاحظہ ہو۔

میر شمس الدین فقیر عباسی دہلوی حفظہ اللہ قدرہ از افاضل زمان و سرودہ سخنوران جہانست ........ در خدمت علماء عصر تحصیل مراتب علوم نمودہ در عربیت و فقہ و کلام و حدیث و تصوف اعجوبۂ زمان و نادرۂ دوران لے"

والہ داغستانی کے مندرجہ بالا بیان سے واضح ہوتا ہے کہ فقیر دہلوی نے اپنے زمانہ کے علماء سے عربی، فقہ، علم کلام، احادیث نبوی اور تصوف کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اپنے آپ کو اس زمانہ میں نادر اور عجوبہ بنا لیا تھا ظاہر ہے علم کے میدان میں یہ شہرت اور مرتبہ ہر شخص کو نہیں ملتا ہے۔ اگر یہ سمجھا جائے کہ والہ داغستانی اسکا دوست تھا۔ اس لئے اس نے اپنے دوست کی تعریف میں مبالغہ آرائی سے کام لیا لیکن اس عہد کے دوسرے تذکرہ نگاروں نے بھی اس کی کچھ کم تعریف نہیں کی ہے۔

آزاد بلگرامی نے لکھا ہے۔

"با عتبار سرمایہ استعداد خداداد .......... در فضل و کمال و شعر و انشاء و معانی و بیان و بدیع و عروض و قوافی و زبان دانی ممتاز اقران سلے"

خان آرزو کا بیان ملاحظہ ہو۔

"خدایش سلامت دارد کہ امروز مثل او در ہند نیست سے"

عبدالحکیم حاکم لاہوری نے لکھا ہے۔

---

لے ریاض الشعراء ص ... سلے خزانہ عامرہ ص ۳۷۵ سے مجمع النفائس ... مردم دیدہ ص ۸۲

"الحق دریں وقت بی ہمتاست وصاحب کمال ہے"[1]

بھگوان داس ہندی کا بیان ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

"بعد رسیدن بہ سن تمیز بہ تحصیل علوم پرداختہ در اندک زمانے اعجوبہ زماں و ناقد دوراں شد۔ در فقہ و کلام و حدیث و تصوف خصوصاً در شعر و انشاء و عروض و قافیہ و معانی و بیان و بدائع مہارت کلی داشت"[2]۔

علی احمد خاں ہاشمی سندیلوی نے لکھا ہے۔

"آبای گرامیش صاحب فضل و روسائے دہلی بودہ اند در فضل و کمال میر شمس الدین شکی نہ بودہ ......... در انشاء و عروض و قافیہ و معانی و بیان و بدیع یکتائے روزگار بودہ"[3]

حسین قلی خاں کا بیان ذیل میں قلمبند کیا جاتا ہے

"از فاضلان عصر خود تحصیل مراتب علیہ نمودہ استعداد کثیر و سرمایۂ وافرہ پیدا ساخت و زبان دانی و خوش لسانی بمرتبہ رسانیدہ کہ اہل عجم از وی حساب برمی داشتند و وی را از گروہ فصحای شمردند"[4]

صدیق حسین خان نے لکھا ہے۔

"باعتبار سرمایۂ استعداد خداداد از اغنیاء زمان بود و در انشاء و شعر و علم معانی و بیان و جز آں از فنون فضل و کمال و زبان دانی فارسی ممتاز اقران می زیست"[5]۔

مندرجہ بالا بیانات کی روشنی میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ فقیر دہلوی علم

---

[1] سرو موزوں ص ۸۳ [2] سفینہ ہندی ص ۱۵۲ [3] مخزن الغرائب
[4] نشتر عشق ورق ۸۹ – ۱۳۸۷ [5] شمع انجمن۔



فن میں ایک بلند مقام رکھتا تھا۔ فقیر دہلوی نے اپنے بچپن کے اوائل کے تقریباً تین سال عالمگیر اورنگ زیب کے عہد سلطنت میں گزارے اور تقریباً تیرہ سال فرخ سیر کے عہد سلطنت میں بسر کیا۔

محمد شاہ ۱۱۳۱ھ میں تخت نشین ہوا۔ اس وقت فقیر دہلوی کی عمر صرف سولہ سال کی تھی لیکن محمد شاہ نے تیس سال تک ہندوستان کے تخت پر حکومت کی اور تخت نشینی کے وقت چونکہ فقیر دہلوی سولہ سال کا تھا اس لئے محمد شاہ کی وفات کے وقت وہ چھیالیس سال کا تھا۔ گویا فقیر دہلوی کی جوانی کا آغاز محمد شاہ کے عہد سلطنت کے اوائل میں ہوا اور اس کے بڑھاپے کی ابتدا محمد شاہ کے حکومت کے آخری دنوں میں ہوئی۔ حاصل کلام یہ کہ فقیر دہلوی کی جوانی کے دن محمد شاہ کے عہد سلطنت میں گذرے اور محمد شاہ کی وفات کے وقت وہ چھیالیس سال کا ہو چکا تھا۔ فقیر دہلوی اپنی جوانی کے اوائل میں عاشق مزاج تھا اس کا پتہ خود اس کے اشعار سے چلتا ہے۔ ذیل میں دو اشعار نقل کرتا ہوں۔

بیمار عشق را طبیب احتیاج نیست — درویست درد عشق کہ او را علاج نیست
عشق از حساب روز جزا کرد فارغم — پیداست اینکہ بردہ ویراں خراج نیست[2]

والہ داغستانی کے بیان سے بھی اس کے عشق کی تصدیق ہوتی ہے۔

"میر علی جناب مزبور مرگز نے شور محبتی و جذبۂ عشقی نمی باشد وگاہ نیست کہ با ہیچ بہشتی معشوق سروکار ندارد وگاہ تخفیف دارد بہ یک کس قناعت نمی فرمایند"[3]

---

[1] ؟ سیر المتاخرین۔ [2] دیوان فقیر۔ خدا بخش۔
[3] ریاض الشعراء ورق ۳۱۲

تخلص[1] والہ داغستانی، علی احمد خاں ہاشمی سندیلوی[2]، آزاد بلگرامی[3] گلشن علی جونپوری[4]، بھگوان داس ہندی[5]، خان آرزو[6]، صدیق حسین خاں[7] حسین قلی خاں، سبھی متفق ہیں کہ میر شمس الدین دہلوی کا تخلص فقیر تھا۔ لیکن آزاد بلگرامی اور علی احمد خان ہاشمی سندیلوی نے میر شمس الدین کا تخلص فقیر کے علاوہ مفتون[8] لکھا ہے۔ پہلے وہ مفتون تخلص کرتا تھا لیکن بعد میں فقیر تخلص اختیار کیا۔ فقیر کے دیوان میں راقم حروف کو دو شعر ملے ہیں جن میں مفتون تخلص استعمال ہوا ہے۔

سینہ عشق ترا مفتون طلبگار است وبس
آن کہ آگاہی ز سوز نالۂ شبہای دل

مفتون ہوس میوۂ فردوس ندارد
از مہر شہنشاہ رسید شش ثمر دل

---

۱۔ ریاض الشعراء ورق ۳۱۴
۲۔ مخزن الغرائب اول ص ۷۵، ۳۔ خزانہ عامرہ مطبوعہ ۳۰۵
۴۔ بحوالہ گل رعنا ص ۲۱۲ ۵۔ سفینۂ ہندی ص ۱۵۲، ۶۔ بحوالہ مردم دیدہ ص ۸۲
۷۔ شمع انجمن۔ ۸۔ نشتر عشق۔



# میر شمس الدین فقیر دہلوی کے اواخر زندگی کے حالات

صد نقد عیش در گرہ غم نہفتہ است
خرم کسی کہ با دل غمناک شاد رفت

بی مطلب است مطلب عارف درین جہاں
عین مراد گشت اگر نامراد رفت

(فقیر دہلوی)

# فقیر دہلوی کے اواخر زندگی کے حالات

فقیر دہلوی نے والہ داغستانی کے بیان کے مطابق ۱۱۴۴ھ میں لباس
فقر اختیار کیا۔ اس وقت اس کی عمر ۲۹ سال تھی لیکن راقم حروف نے جیسا کہ
قبل لکھا کہ فقیر اپنی جوانی کے اوائل میں عاشق مزاج تھا اور ایک ہی معشوق سے
سروکار نہیں تھا بلکہ کبھی کبھی پانچ چھ معشوقوں سے اس کو لگاؤ رہتا تھا۔
والہ داغستانی نے جو فقیر دہلوی کا دوست تھا اس راز کو ظاہر کیا ہے۔ اس کے
بیان کو ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

"میر حالی جناب مزبور ہرگز بی شور تحتی و جذبۂ عشق می باشد و گاہ
ہست کہ پانچ شش معشوق سروکار دارد و گاہ تخفیف دارد بہ یک
کس قناعت می فرمایند[1]

والہ داغستانی کے مندرجہ بالا بیان کی روشنی میں یہ بات ثبوت کو پہنچ گئی کہ
فقیر دہلوی کی اوائل کی زندگی عاشقانہ تھی لیکن کسی تذکرہ میں اس کی معشوقہ کا نام
نہیں ملتا جیسا کہ فارسی کے بعض شعراء کے معشوقوں کا نام تذکروں میں ملتا ہے
مثلاً حافظ شیرازی کے بارے میں مشہور ہے کہ شاخ نبات اس کی محبوبہ تھی۔
قدرت کا یہ اصول ہے کہ عشق مجازی میں شکست کے بعد انسان کے
شدید طور پر مجروح ہونے کے بعد بیدار ہوتے ہیں اور انسان کی زندگی میں ناکامی

[1] ریاض الشعراء ورق ۳۱۴



و نامرادی عشق مجازی کی وجہ سے اس کے دل میں عشق حقیقی کی شمع
روشن ہوتی ہے اور ایک دن اس شمع کی روشنی اپنے گرد و پیش میں ہی نہیں بلکہ
دور دراز مقامات میں پھیل جاتی ہے۔ حضرت سرمد شہید بھی عشق مجازی سے
عشق حقیقی میں وارد ہوئے اور وحدانیت و عرفان کا ایسا جام پیا کہ دنیا اس سے
واقف ہے کسی عاشق کا صوفی اور مرد فقیر بن جانا کوئی تعجب کی بات نہیں تاریخ
اور تذکرے اس بات پر شاہد ہیں۔ اگر فقیر دہلوی نے بھی لباس فقر اختیار کیا
تو اس میں کوئی حیرت نہیں۔ بلکہ شکست عشق مجازی نے اس کے دل میں دنیاوی معشوقوں سے
نفرت پیدا کر دی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے لباس فقر اختیار کرنے کے بعد تجرد کی
زندگی گذاری اور شادی نہیں کی کیونکہ کسی تذکرہ میں اس کی شادی و اولاد کا ذکر
نہیں ملتا۔ اس لئے یہ بات بہت حد تک صحیح معلوم ہوتی ہے کہ اس نے شادی
نہیں کی۔ عرفی شیرازی کا بھی یہ خیال تھا کہ انسان عشق مجازی کے بعد ہی عشق حقیقی
کی روشنی سے منور ہوتا ہے۔ ذیل میں اس کا شعر درج کیا جاتا ہے۔

صید دل را بہر آگاہی ز صیاد ازل
در کمند طرۂ عنبر فشاں انداختہ[1]

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فقیر دہلوی نے اپنی زندگی کے کس حصہ میں
لباس فقر اختیار کیا اس کے دوست والہ داغستانی کے بیان سے یہ بات
واضح ہوتی ہے کہ ۱۱۶۱ھ (جس سال ریاض الشعراء تالیف ہوا) کے سترہ سال
قبل یعنی ۱۱۴۴ھ میں فقیر دہلوی نے لباس فقر اختیار کیا اس وقت فقیر کی عمر
۲۹ سال تھی ذیل کی عبارت ملاحظہ ہو۔

"ہفدہ سال قبل از تحریر این اوراق ترک اسباب و علائق

[1] قصائد عرفی

نمودہ ملبس بلباس درویشان شدہ [1]

اس سلسلہ میں آزاد بلگرامی کا بیان بھی والہ داغستانی کے بیان سے مطابقت رکھتا ہے

"در مبادی عشرہ خامسہ بعد مائہ والف کم علائق دنیوی گرفتہ

در لباس فقر در آمد" [2]

قدرت نے بھی لکھا ہے کہ فقیر نے ۱۱۴۳ھ میں ترک عوائق دنیوی کیا اور صوفی ہو گئے

"در آغاز عشرہ خامسہ بعد مائۃ الف ترک عوائق دنیوی کردہ

[illegible]ت فقر در بر کشیدہ" [3]

فقیر دہلوی ۲۹ سال کی عمر سے اپنی زندگی کے آخری دنوں تک لباس فقر میں مست و بیخود رہے۔ اس کا ذیل کا شعر ملاحظہ ہو۔

دولت جاوداں فقیر از ماست [1]

فقر ما بار نخل اقبال است

ڈاکٹر رضازادہ شفق [2] نے ایرانی تصوف کی دو قسم بتائی ہے

(۱) منفی :۔ اس سے مطلب دنیا کو ترک کرنا، قناعت کرنا، شہوتوں کو مارنا اور ترک لباس ہے اس تصوف کو ہندوستانی تصوف سے مشابہت ہے۔

(۲) مثبت :۔ اللہ کی مرضی کے مطابق زندگی گذارنا ایثار خلوص محبت عبادت، عشق الہی، خدا کے حکم پر چلنا اور مخلوق کی خدمت کرنا وغیرہ

اس لئے وہی صوفی کامل ہے جو قرآن سے اچھی طرح واقف ہو اور دلیل

---

[1] ریاض الشعراء ورق ۳۱۴ [2] خزانہ عامرہ ص ۳۰۸ [3] نتائج الافکار مطبوعہ ص ۵۴۷

[2] دیوان فقیر خدا بخش [2] تاریخ ادبیات ایران ص ۱۰۱ — ۱۵۰



اور منطق سے بھی نابلد نہ ہو اور ذکر حق اور عبادات سے صوفیت کے درجہ پر جلوہ افروز ہو جائے۔ اپنے دل و دماغ کو مخلوق کے عشق سے لبریز کر دے اور اپنے دل کے آئینہ کو روشن رکھے اور سمجھے کہ ہر شے میں ذات باری کا نور چھپا ہوا ہے

ڈاکٹر رضا زادہ شفق مرحوم نے لکھا ہے کہ صوفیوں کا شیوہ درویشی اور فروتنی ہے اس لئے جتنے بھی صوفیائے کرام گذرے ان لوگوں نے عاجزی، تواضع، خدمت خلق اور بے ریائی کا طریقہ اختیار کیا تھا۔ ان حضرات نے ہمیشہ شہرت سے گریز کیا اور خدا کی طاقت اور قدرت کے مقابلہ میں مخلوق کو نہایت ناتواں اور کمزور سمجھا کبھی اپنی بڑائی اور بلندی کا انھوں نے خیال نہیں کیا۔ انھوں نے دنیاوی مال و دولت سے کنارہ کشی اختیار کی بلا شبہ فقیر دہلوی کو یہ مقام صوفیت وراثت میں ملا تھا کیونکہ اس کے اسلاف میں شیخ عبد العزیز دہلوی اور شاہ محمد خیالی جیسے خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ علم فقہ، کلام حدیث اور علم تصوف میں فقیر دہلوی چونکہ ماہر تھا اس لئے اس کو مقام صوفیت طے کرنے میں کوئی دشواری پیدا نہیں ہوئی کسی صوفی کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ علم کلام اور احادیث نبوی سے واقف ہو۔ ورنہ اس کو ہر مقام پر شکست ہو سکتی ہے اور اس کی پرواز وہ نہیں ہو سکتی جو ایک صاحب علم و فضل کی ہوتی ہے کیونکہ جاہل فقیر شیطان کا مسخرہ ہوتا ہے فقیر دہلوی کو بھی اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ وہ مرد فقیر ہے جیسا کہ اس کے ذیل کے شعر سے واضح ہوتا ہے۔

شد رتبہ فقیر بلند از فروتنی [2]

نشو و نما ز خاک نشینی است دانہ را

---

[1] تاریخ ادبیات ایران ص ۱۴۰ — ۱۵۰

[2] دیوان فقیر۔ خدا بخش

**سفر دکن** :- مختلف تذکروں کے بیان سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ فقیر دہلوی نے ۳۰ سال کی عمر میں (۱۱۴۴ھ) لباس فقر اختیار کرنے کے بعد اورنگ آباد کا سفر کیا اور چند سال وہاں مقیم رہا۔ اس سفر کا مقصد نظام الملک آصف جاہ صوبہ دار دکن سے ملاقات تھا کیونکہ بیشتر تذکروں میں یہ بات درج ہے کہ فقیر دہلوی سے نظام الملک آصف جاہ کو بڑی محبت تھی۔ اس لئے فقیر کو دکن جانا پڑا۔ ذیل میں علی احمد خاں ہاشمی سندیلوی کا بیان مرقوم ہے

"بسبب فرط محبت کہ نواب نظام الملک باو داشت بیار دکن رفتہ[1]"

آزاد بلگرامی نے لکھا ہے۔

"در عہد ایام سیر بسیر دکن کشید و چندیں سال در اورنگ آباد ........................ اقامت ریخت ........ و بعد پنج سال ہمراہ قزلباش خان امید بہ شاہجہان آباد عطف عنان نمود[2]"

والہ داغستانی کا بیان ہے۔

"بہ تماشائے دکن تشریف بردہ بود ........ مدتی پنج سال اکثر بلاد آن ملک ذاگردیدہ بہ شوق دیدن والد پیر خود بہ دہلی مراجعت نمود تا حال در شہر مزبور سکونت دارد[3]"

مندرجہ بالا بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ فقیر دہلوی پانچ سال تک دکن میں رہا (یعنی ۱۱۴۴ھ سے ۱۱۴۹ھ تک) اور ۱۱۴۹ھ ہی میں قزلباش خان امید کیساتھ دہلی واپس آیا[4]۔ اس پانچ سال کی مدت میں فقیر دہلوی نے دکن کے مختلف شہروں اور دیہاتوں کو دیکھا اور نظام الملک آصف جاہ کا مہمان رہا۔ اس زمانے میں

---

[1] مخزن الغرائب ص [2] خزانۂ عامرہ ص [3] ریاض الشعراء
[4] خزانۂ عامرہ



نظام الملک آصف جاہ دکن کا صوبہ دار تھا اور محمد شاہ دہلی کے تخت پر جلوہ افروز تھا۔ فقیر دہلوی کی زندگی کے یہ پانچ سال جو اس نے دکن میں گذارے نہایت فارغ البالی اور مرفہ الحالی میں بسر ہوئے کیونکہ نظام الملک آصف جاہ کیطرف سے ہر طرح کی آسایش کے انتظامات رہے ہونگے۔ اگر نظام الملک آصف جاہ سے محبت اور الفت نہ ہوتی تو فقیر دہلوی دکن نہیں جاتا اور ایسی حالت میں یہ بات کہی جا سکتی تھی کہ اس کی پانچ سال کی زندگی جو دکن میں گذری آرام و آسایش کے ساتھ گذری ہوگی۔ لیکن جب وہ خود صوبہ دار دکن کا مہمان تھا تو ایسی حالت میں یہ بات قرین قیاس ہے کہ اس کی زندگی کا یہ زمانہ فارغ البالی کے ساتھ گذرا ہوگا۔

۱۱۵۱ھ میں ہندوستان پر نادر شاہ کا حملہ ہوا۔ فقیر دہلوی نے اپنی آنکھوں سے دہلی میں نادر شاہ کا قتل عام ۱۱۵۱ھ میں دیکھا ہوگا کیونکہ اس وقت وہ دہلی ہی میں تھا اور دکن سے واپس آچکا تھا۔ شیخ محمد علی حزین بھی اس وقت نادر شاہ کے خوف سے دہلی ہی میں والہ داغستانی کے مکان پر گوشہ نشین تھا۔ نادر شاہ کا قتل عام ایک ایسا تاریخی واقعہ تھا جس نے بڑے بڑے بہادروں کو خوف زدہ بنا دیا تھا۔ دہلی کی گلیاں اور سڑکیں لاشوں سے پٹ گئی تھیں اور سارا شہر لاشوں کے سڑنے کی وجہ سے متعفن ہو گیا تھا۔ نادر شاہ نے اپنے سپاہیوں کو قتل عام بند ہونے کے بعد حکم دیا تھا کہ مکانوں کے برباد ہونے کی وجہ سے جو لکڑیاں جمع ہوئی ہیں ان میں آگ لگا کر لاشوں کو جلا دیا جائے تاکہ شہر کی ہوا صاف ہو جائے۔ فقیر دہلوی نے اگرچہ ۱۱۴۴ھ میں لباس فقر اختیار کیا تھا لیکن راقم حروف کا خیال ہے کہ نادر شاہ کے قتل و غارت کا منظر دیکھنے کے بعد اس نے اپنے آپ کو پورے طور پر روحانیت کی طرف مائل کر لیا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ ایسے واقعات دلوں پر خاص اثر ڈالتے ہیں اور بہت سے لوگ

روحانیت کا احساس اختیار کر لیتے ہیں سنہ ۱۱۶۷ھ میں بھی فقیر دہلوی دہلی ہی میں تھا[1]
آزاد بلگرامی اور قدرت اللہ نے لکھا ہے کہ فقیر دہلوی عماد الملک غازی الدین
خاں کے ساتھ اکبر آباد (آگرہ) گیا تھا اور چند مہینوں کے بعد اسی سال واپس
آیا جس سال وہ خزانہ عامرہ لکھ رہا تھا[2] چونکہ خزانہ عامرہ سنہ ۱۱۷۶ھ میں
مکمل کی گئی اس لیے واضح ہے کہ فقیر سنہ ۱۱۷۶ھ میں آگرہ گیا ہوگا اور چند مہینے
کے بعد اسی سال دہلی واپس چلا آیا[3]

لچھمی نرائن شفیق نے لکھا ہے کہ فقیر دہلوی سنہ ۱۱۸۰ھ میں لکھنؤ سے اورنگ آباد
آیا۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ سنہ ۱۱۸۰ھ میں فقیر دہلوی لکھنؤ میں تھا لیکن
کب سے وہ وہاں تھا اور کتنے دنوں تک رہا اس کا پتہ کسی تذکرہ سے نہیں چلتا
ہے البتہ اتنا ثابت ہے کہ وہ سنہ ۱۱۸۰ھ میں لکھنؤ سے اورنگ آباد آیا تھا شفیق
اورنگ آبادی اس وقت اورنگ آباد ہی میں تھا اور اکثر و بیشتر فقیر دہلوی سے
اس کی ملاقات ہوتی تھی۔ لچھمی نرائن شفیق نے فقیر کی آمد پر ایک قطعہ تاریخ
لکھ کر فقیر کی خدمت میں پیش کیا جسے پڑھ کر وہ بہت خوش ہوا ذیل میں
وہ قطعہ تاریخ نقل کی جاتی ہے۔

| | |
|---|---|
| وارد این شہر در ذی الحجہ شد | شاعر و دانشور و روشن ضمیر |
| سال تاریخ قدوم او شفیق | گفت آمد میر شمس الدین فقیر |

یک ہفتہ کہ در شہر متوقف بود ہر روز تشریف بہ دولت خانہ
میر صاحب آزاد مدظلہ آورده صحبت مستوفی میداشت و ہر جا
ہم در منزل اوی رفتہ شد[4]

[1] گل رعنا [2] خزانہ عامرہ [3] نتائج الافکار ص ۵۴۸ ۔
[4] گل رعنا [5] گل رعنا



حسین قلی خاں کا بیان بھی لچھمی نرائن شفیق کے بیان سے مطابقت
رکھتا ہے۔ اس نے بھی لکھا ہے کہ سنہ ۱۱۸۱ھ میں فقیر دہلوی اورنگ آباد گیا اور
اورنگ آباد میں اکثر آزاد بلگرامی کے ساتھ اس کی صحبت رہی۔ حسین قلی خاں
نے لکھا ہے کہ فقیر دہلوی صرف ایک ہفتہ اورنگ آباد میں مقیم رہا اس کے
بعد بندرگاہ سورت کی طرف روانہ ہوا۔ اس نے بقعات طیبات کی زیارت
کی اور دو سال تک سفر میں رہنے کے بعد سنہ ۱۱۸۳ھ میں اپنے وطن ہندوستان
کے لیے روانہ ہوا۔ ذیل میں حسین قلی خان کا بیان لکھا جاتا ہے

در سنہ یک ہزار و یک صد و ہشتاد و یک شوق زیارت
عتبات عالیات دامنگیر حال او گردیدہ کشان کشان براہ سعادت
برد چنانچہ بشد یہ عزیمت بجولان در آورده باورنگ آباد رسید
وا ز آزاد وغیرہ صحبتہا نمودہ بعد یک ہفتہ روانہ بندر سورت
گردید و از انجا عازم پیشتر شد و بہ بقعات طیبات رسیدہ و حصول
مرام نمودہ پس از انقضاء دو سال در سنہ یک ہزار و یک صد ہشتاد
و سہ روانہ ہندوستان شدہ بود[5]

لچھمی نرائن شفیق کی تحریر سے یہ بات روشن ہوتی ہے کہ فقیر دہلوی
۹ محرم سنہ ۱۱۸۱ھ میں بندرگاہ سورت کے لیے اورنگ آباد سے روانہ ہوا اور
۲۸ محرم کو اسی سال سورت بندرگاہ پر پہنچ گیا۔ یہاں سے اپنے بندرگاہ سورت
پہنچنے کی خبر اس نے آزاد بلگرامی کو بذریعہ خط بھیجی اس بیان سے واضح ہوتا ہے
کہ فقیر دہلوی کو اورنگ آباد سے بندرگاہ سورت پہنچنے میں ۲۲ دن لگ گئے
کیونکہ اس زمانہ میں سفر آجکل کی طرح آسان نہیں تھا۔ مسافر کو راہ میں

تذکرہ شفیق

بڑی بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور وہی لوگ سفر کرتے تھے جو صحت مند اور صاحب ہمت ہوتے تھے چونکہ اس زمانہ میں ڈاکوؤں اور راہ زنوں کا بھی بڑا خطرہ تھا اس لیے لوگ قافلہ کی شکل میں سفر کرتے تھے. فقیر دہلوی کے اس سفر میں کون لوگ اس کے ساتھ تھے اسکا علم کسی تذکرہ سے نہیں ہو سکا ذیل میں شفیق کی تحریر نقل کی جاتی ہے۔

"در آخر العمر میر ششم محرم سنہ احدی وثمانین ومأتہ والف عازم بندر مبارک سورت گردید و بست وہشتم ماہ مذکور در آن جا رسیدہ خبر وصول خود بہ جناب میر صاحب قبلہ نوشت" لہ

حسین قلی خان کے بیان کو اگر صحیح سمجھا جائے تو فقیر دہلوی دوسری بار جب اورنگ آباد گیا تو صرف ایک ہی ہفتہ وہاں مقیم رہا اور وہ ۱۱۸۰ھ میں اورنگ آباد نہیں گیا بلکہ ۱۱۸۱ھ میں گیا. لیکن لچھمی نرائن شفیق کے بیان کو اگر درست سمجھا جائے تو فقیر دہلوی ۹ ذی الحجہ ۱۱۸۰ھ میں اورنگ آباد پہنچا اور ۱۰ محرم ۱۱۸۱ھ میں اورنگ آباد سے بندرگاہ سورت کیلئے روانہ ہوا. اس طرح شفیق کے بیان کے مطابق فقیر دہلوی تقریباً ۲۶ – ۲۷ دن اپنے دوسرے سفر میں اورنگ آباد میں رہا. اور یہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ شفیق اورنگ آبادی اس وقت اورنگ آباد ہی میں تھا اور فقیر دہلوی سے اس کی ملاقات بھی ہوئی تھی. لیکن شفیق نے فقیر دہلوی کے حالات کے سلسلہ میں آگے چل کر لکھا ہے کہ ایک ہفتہ فقیر دہلوی شہر (اورنگ آباد) میں رہا اور اس درمیان ہر روز وہ آزاد بلگرامی کے دولت خانہ پر جاتا رہا. بہت ممکن ہے کہ فقیر دہلوی شہر اورنگ آباد میں ایک ہی ہفتہ رہا ہو اور ۱۸ – ۱۹ دن اورنگ آباد کے بعض قصبوں میں رہا ہو

لہ گل رعنا.



بھگوان داس ہندی نے لکھا ہے کہ جب شاہجہاں آباد دہلی اجڑ گئی تو فقیر دہلوی لکھنؤ آئے. اس شہر کے لوگوں نے اسکی بڑی عزت کی اور میرزا ابچو ذرہ نے اس سے اصلاح لی. بھگوان داس نے اسکو لکھنؤ میں دیکھا بھی تھا اس کے بیان کے مطابق فقیر دہلوی ایک سال لکھنؤ میں رہا اس کے بعد کربلائے معلی کے لیے روانہ ہو گیا ذیل میں بھگوان داس ہندی کی عبارت نقل کی جاتی ہے.

"بعد خرابی شاہجہاں آباد بلکھنؤ وارد شدہ بود مردم این شہر مقدم او را غنیمت دانستہ بعزت و توقیرش می کوشیدند در ہنگام اوائل مشق میرزا ابچو ذرہ بود اشعار خود از نظر اصلاحش می گذرانید راقم او را دیدہ عجب دارستہ کسی بود ....... یک سال در لکھنؤ ماند روانہ کربلای معلی شد" لہ

یہاں سے زیارت کرنے کے بعد فقیر دہلوی سامرہ گیا ہوگا کیونکہ یہاں بھی جلیل القدر امام کا روضہ مبارک ہے.

تذکروں سے واضح ہوتا ہے کہ فقیر دہلوی ۱۱۸۳ھ میں زیارت کر کے واپس ہو رہا تھا کہ سمندر میں کشتی غرق ہونے کی وجہ سے اس کی وفات ہو گئی. اس بیان کی روشنی میں یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جب اس نے ۱۱۸۱ھ میں ماہ محرم الحرام میں سفر زیارت شروع کیا تھا اور ۱۱۸۳ھ میں واپس آ رہا تھا تو اس حساب سے اس سفر میں تقریباً دو ڈھائی سال اس نے صرف کیا اس لیے قرین قیاس ہے کہ وہ جب دو سال سے زیادہ اس سفر میں رہا تو اس نے ضرور حج بھی کیا ہوگا.

لہ سفینہ ہندی ص ۱۰۹ استاد محترم ڈاکٹر عبد النفار الدعمار کا کہنا ہے کہ اپنے سفر ایران کے موقع پر ان مقامات کی زیارت کی اور وہاں کے خادموں سے ان کو معلوم ہوا کہ اہل تشیع حج کے پہلے ان مقامات کی زیارت کرنا مستحسن سمجھتے ہیں.

کیونکہ آخر اس نے دو ڈھائی سال کی مدت کہاں گذاری اور چونکہ وہ ایک ممتاز صاحب علم و فضل اور باکمال صوفی تھا اس لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ صرف عتبات عالیات (یعنی کربلائے معلی، نجف اشرف، کاظمین اور سامرہ) کی زیارت کر کے وطن واپس آجاتا۔ ایک صوفی یا صاحب عرفان کی زیارت اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ خانہ کعبہ اور گنبد خضرا کی زیارت نہ کرے۔ اسلام کا ایک رکن حج بھی ہے اور ایک مرد عارف کے لئے حج کے فریضہ سے بڑھکر کوئی شے نہیں۔ یہ وہ تمنا ہے، جو اکثر و بیشتر صاحب معرفت کو بے چین کر دیتی ہے علامہ اقبال جیسے مرد فقیر کو یہ سعادت نصیب نہ ہو سکی لیکن وفات کے وقت وہ اس خیال سے بے چین تھے۔ تذکروں اور تاریخ کے مطالعہ سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اکثر و بیشتر صوفیائے کرام اور فقرائے اسلام نے حب رسول میں دور دراز مقامات کے دشوار گذار سفر طے کئے اور اللہ کے گھر کی زیارت کی آرزو کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ مسجد نبوی میں عبادات کی تمنا کس زاہد و عارف کو بے چین نہیں کرتی ہے۔ بھلا ایسی صورت میں فقیرؔ دہلوی جیسا مرد فقیر دو ڈھائی سال وطن سے باہر سرزمین عراق میں بسر کرنے کے بعد اللہ اور اللہ کے رسول کے گھر کی زیارت کئے بغیر کیسے واپس آجاتا۔ اس لئے راقم حروف کو اس بات کا یقین ہے کہ جب فقیرؔ دہلوی کو کربلائے معلی پہنچنے کا موقع ملا اور دو ڈھائی سال کا زمانہ بھی اسے میسر ہوا تو اس نے ضرور حج بھی کیا ہوگا اور اس کے حج کا زمانہ ۱۱۸۱ھ اور ۱۱۸۳ھ کے درمیان کا ہے۔

بھگوان داس ہندی کا بیان ملاحظہ ہو۔

"یک سال در لکھنؤ ماند روانہ کربلای معلی شد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گویند از زیارت فراغت کردہ ۔"[1]

---

[1] سفینۂ ہندی۔



حسین قلی خان نے لکھا ہے۔

"در سنہ یک ہزار یک صد و ہشتاد و یک شوق زیارت عتبات عالیات دامنگیر حال او گردیدہ کشاں کشاں براہ سعادت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہ بقعات طیبات رسیدہ و حصول مرام نمودہ پس از انقضاء دو سال در سنہ یک ہزار یک صد و ہشتاد و سہ روانہ ہندوستان شدہ۔"[2]

ابو طالب ابن حاجی محمد بیگ خان تبریزی اصفہانی کا بیان نقل کیا جاتا ہے۔

"گویند از زیارت فراغت کردہ۔"[3]

لچھمی نرائن شفیقؔ اور بھگوان داس ہندی دونوں کے اس بیان میں تضاد ہے شفیقؔ[1] کے بیان کے مطابق فقیرؔ دہلوی اورنگ آباد سے ۲ محرم ۱۱۸۱ھ میں بندرگاہ سورت کے لئے روانہ ہوا تھا تاکہ وہاں سے زیارت کو جاتا لیکن بھگوانؔ داس ہندی نے لکھا ہے کہ فقیرؔ دہلوی لکھنؤ سے ہی کربلائے معلی کے لئے روانہ ہوا تھا۔ راقم حروف کا خیال ہے کہ شفیقؔ اورنگ آبادی چونکہ اس وقت اورنگ آباد ہی میں تھا اور فقیرؔ دہلوی سے اکثر و بیشتر اس کی ملاقات بھی ہوتی تھی اور اس نے فقیرؔ دہلوی کے سفر بندرگاہ سورت کی تاریخ اور سال بھی لکھ دیا ہے۔ اس کا بیان زیادہ اہم ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بھگوان داس ہندی نے تذکرہ "گل رعنا" نہیں دیکھا ورنہ اس سے ایسی غلطی نہیں ہوتی۔

تذکروں کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے فقیرؔ دہلوی ۲۸ محرم ۱۱۸۱ھ کو بندرگاہ سورت پہنچ گیا اور یہاں سے وہ جلد ہی کربلائے معلی کی زیارت کے لئے کشتی سے روانہ ہوا لیکن کسی تذکرہ سے یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس سال کربلا یا نجف اشرف پہنچا اور کربلا یا نجف اشرف میں کتنے دن رہا۔ اس کے علاوہ یہ بھی

---

[1] نشتر عشق ص [2] خلاصۃ الافکار ص [3] گل رعنا ص ۔ سفینۂ ہندی۔

نہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ کاظمین شریف یا سامرہ گیا تھا یا نہیں لیکن چونکہ وہ شیعہ تھا اس لیے تذکروں میں جب اس کے سفر کربلا کا ذکر ہے تو وہ نجف اشرف بھی ضرور گیا ہوگا اور وہاں اس نے حضرت علیؓ کے مزار اقدس کی زیارت کی ہوگی اس کے بعد وہ کربلا گیا ہوگا۔ کربلا سے واپسی میں یا قبل ہی وہ کاظمین شریف بھی ضرور گیا ہوگا کیونکہ یہاں امام موسیٰ کاظمؑ اور امام ہادی کے روضہ مبارک ہیں جو خصوصاً اہل تشیع کے لئے زیارت گاہ ہے۔

**وفات فقیر** :- آزاد بلگرامیؒ، محمد حسین قلی خانؒ، اور قدرت اللہؒ متفق ہیں کہ فقیر کی وفات ۱۱۸۳ھ میں ہوئی۔ حسین قلی خانؒ نے آزاد بلگرامی کی نوشتہ تاریخ وفات کو اپنے تذکرہ میں نقل کیا ہے جسے راقم حروف ذیل میں قلمبند کرتا ہے۔

رفت از عالم سخنوری شیریں ہای خوابیدہ بخاک شاعری رنگیں ہای

آزاد نوشت مصرع تاریخش گو آہ فقیر شمس الدین ہائی

**آخری آرامگاہ فقیر** :- حسین قلی خان، بھگوان داس ہندی، علی احمد خاں ہاشمی سندیلوی، ابوطالب اصفہانی اور قدرت اللہ بھی متفق ہیں کہ فقیر دہلوی کی وفات سمندر میں کشتی کے غرق ہونے کی وجہ سے ہوئی۔ کسی تذکرہ سے اس بات کا پتہ نہیں چلتا ہے کہ اس کی نعش سمندر سے نکالی جا سکی یا نہیں لیکن جب کشتی ہی ڈوب گئی اور وہ بھی سمندر میں اس وجہ سے قرین قیاس ہے کہ اس کی نعش سمندر سے برآمد نہ ہو سکی اور اس کی آخری آرامگاہ سمندر کا شکم ہی بنا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ زیارت سے فراغت کے بعد ہندوستان واپس آ رہا تھا تو اس کی کشتی کس جگہ غرق ہوئی۔ صرف علی احمد خاں ہاشمی سندیلوی اور حسین قلی خان کے بیان سے

---

۱؎ خزانہ عامرہ ص ۳۸۰ ۲؎ نشتر عشق ص ۱۳۸۹ ۳؎ نتائج الافکار ص ۵۴۸

۵؎ خزانہ عامرہ میں یہ قطعہ تاریخ مرقوم ہے



واضح ہوتا ہے کہ فقیر دہلوی جس کشتی پر سوار تھا وہ بصرہ میں غرقاب ہوئی لیکن علی احمد خاں ہاشمی سندیلوی نے بصرہ یا "جای دیگر" لکھا ہے اس لئے یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ صحیح معنی میں اس کی کشتی کس جگہ غرق ہوئی۔ ذیل میں حسین قلی خاں کی عبارت نقل کی جاتی ہے۔

"تا بہ بصرہ آمد او غریق رحمت الہی گردید"۱؎

علی احمد خاں ہاشمی نے لکھا ہے۔

"در بلدۂ بصرہ یا جای دیگر کشتی طوفانی بہ رحمت حق واصل گردید"۲؎

بھگوان داس ہندی رقم طراز ہے۔

"گویند از زیارت فراغت کردہ از راہ دریای شور بر کشتی سوار شدہ ارادہ معاودت شاہجہاں آباد کشتی حیاتش غرق بحر رحمت شد"۳؎

قدرت اللہ کا بیان ہے

"بعزیمت ہند بہ مرکب دریای شور نشست قضارا کشتی شکست وسرمایۂ حیاتش در گرداب فنا در افتاد و این ماجرا در ۱۱۸۳ھ ثلاث و ثمانین ومائۃ والف رو داد"۴؎

فقیر دہلوی کی وفات پر آزاد بلگرامی کو بہت افسوس ہوا کیونکہ فقیر دہلوی کے ساتھ اس کے گہرے تعلقات تھے اور سفر زیارت میں جانے سے قبل بھی اورنگ آباد میں اس سے ملاقات ہوئی تھی آزاد بلگرامی نے فقیر دہلوی کی وفات پر جو قطعہ تاریخ لکھا اس میں اپنے رنج و غم کا اظہار اس طرح کیا۔ افسوس ایک شیریں سخنور دنیا سے رخصت ہوا۔ افسوس ایک رنگین شاعر مٹی پر سویا۔ آہ اے فقیر میر شمس الدین آہ۔

---

۱؎ نشتر عشق ص ۱۳۸۹۔ ۲؎ مخزن الغرائب ۳؎ سفینۂ ہندی

۴؎ نتائج الافکار ص ۵۴۸

فقیر دہلوی کی یہ تمنا تھی وہ اپنے سر کو محبوب ازلی کے قدموں میں رکھدے اور اس کی موت ہو جائے اور اس کی یہ دیرینہ آرزو اس وقت پوری ہوئی۔ جب وہ محبوب ازلی کے پیارے محبوب اور خود محبوب ازلی کے گھر کی زیارت کرکے واپس آرہا تھا تو سمندر نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کو اپنی آغوش میں سلا دیا ایک زائر کیلئے اس سے بڑھکر کیا سعادتمندی ہو سکتی ہے کہ وہ زیارت سے اپنے آپ کو معصوم اور تر و تازہ بنا کر واپس ہو رہا ہو اور گھر پہنچنے سے قبل اللہ سے جا ملے فقیر کی زیارت کا ایک بڑا مقام ہے اور ایسا گمان ہوتا ہے کہ اس کی یہی تمنا رہی ہو کہ وہ دیار حبیب ہی میں یا دیار حبیب سے واپسی میں گھر پہنچنے سے قبل ہی وفات پا جائے تاکہ دنیا اور دنیا کے کاروبار میں پھر سے داخل ہونے کا موقع نہ ملے کیونکہ انسان انسان ہے اور گناہ اور خطا اس کی فطرت میں ہے۔ آخر میں راقم الحروف فقیر دہلوی کے ذیل کے شعر پر اس باب کو ختم کرتا ہے۔

می گذارم سر خود در قدم یار فقیرؔ
ایں قدر ہا ز من خاک بسر می آید[1]

---

[1] دیوان فقیر خدا بخش



# باب ۵

## سیرت و شخصیت فقیر دہلوی

از عاشقان پاک او فرق است با اہل ہوس
آری نہ باشد نسبتی با مشک خون مردہ را
شوریدگان عشق را بی پردہ و رسوا مکن
یکبارہ ظالم برمگیر از روی خوبت پردہ را
(فقیر دہلوی)

شد رتبۂ فقر بلند از زینہ
نشو و نما ز خاک تہی است دہ را

فقیر دہلوی کی زندگی کے تفصیلی حالات تذکروں میں نایاب ہیں۔ فارسی تذکروں میں یہ بڑا عیب ہے کہ تمام تذکرہ نگار عام طور پر ایک ہی طرح کی باتیں لکھتے ہیں اگرچہ آزاد بلگرامی، والہ داغستانی، خان آرزو، لچھمی نرائن شفیق اور بھگوان داس ہندی کی ملاقاتیں فقیر دہلوی سے ہوئی تھیں لیکن ان تذکرہ نگاروں نے بھی بعض اہم حالات بیان نہیں کئے ہیں۔ اس لئے راقم حروف کو بہت تگ و دو کرنی پڑی۔ چونکہ فقیر دہلوی کا خاندانی سلسلہ شیخ عبدالعزیز دہلوی سے جا ملتا ہے اس لئے خاندانی طور پر فقیر دہلوی ایک بلند و برتر مقام کا حامل ہے۔

خاندانی حیثیت ایک ایسی امتیازی شے ہے جو بلاشبہ انسان کو بلند مقام پر پہنچا دیتی ہے ماہرین نفسیات اس پر متفق ہیں کہ اچھے اور خوشگوار ماحول میں تربیت یافتہ شخصیتیں بلند و بالا مقام کی حامل ہوتی ہیں علم کتابی سے وہ فائدے حاصل نہیں ہوتے جو بزرگوں اور عالموں کی صحبت سے ہوتے ہیں۔ مولانا روم بھی اس کے قائل تھے کہ ایک لمحہ کی بزرگوں کی صحبت سو سال کی عبادت سے بہتر ہے۔ ذیل میں مولانا روم کا شعر نقل کیا جاتا ہے۔

یک زمانہ صحبتے با اولیا
خوشتر از صد سالہ طاعت بے ریا

اچھے ماحول اور اچھی صحبت کا بلاشبہ اچھا اثر مرتب ہوتا ہے اور برسوں کی راہیں پل بھر میں طے ہو جاتی ہیں۔ عہد طفولیت اور سن تمیز میں انسان کو خصوصاً اچھے ماحول کی ضرورت ہے تاکہ اسکے کردار کی صحیح تربیت ہو علامہ اقبال کا



بھی یہی خیال تھا

صحبت از علم کتابی خوشتر است
صحبت مردان حُر آدم گر است

می نروید تخم دل از آب و گل
بی نگاہ از خداوندان دل

فقیر دہلوی صرف ایک صوفی اور شاعر ہی نہیں تھا بلکہ والہ داغستانی کے بیان کے مطابق وہ عربی دانی، فقہ، علم کلام، حدیث اور تصوف میں اپنے شہر میں بے مثال تھا اور مخلوق کے ساتھ نہایت بے تکلفی اور خلوص سے پیش آتا تھا۔ اپنے دل کے درد کو وہ پوشیدہ رکھتا تھا تاکہ لوگ ان کی غمزدہ باتوں کو سن کر غمگین نہ ہوں۔ ظاہر ہے جو شخص علم کلام اور تصوف میں باکمال ہو اور جسکی شخصیت میں خاکساری اور عاجزی ہو بلاشبہ ایسا شخص دنیا میں مشکل سے ملتا ہے۔ علامہ اقبال نے ایسی شخصیتوں کے متعلق اظہار خیال کیا ہے۔

از جنونش ہر گریباں چاک نیست ٭ درخور این شعلہ ہر خاشاک نیست

والہ داغستانی نے اپنے دوست فقیر دہلوی کی شخصیت کی تعریف ذیل کے شعر میں کی ہے۔

نکتہ سنجی کہ بود بی اشتباہ
عاجز از تعریف و توصیفش زبان

بلاشبہ مختلف علوم و فنون مثلاً علم معانی، انشاء، علم بیان، علم بدیع و عروض میں ید طولیٰ رکھنے کی وجہ سے فقیر دہلوی کی شخصیت ایک ہمہ گیر شخصیت ہو گئی تھی۔ اس عہد کے بیشتر صاحب علم و فضل اور شعراء نے فقیر دہلوی

اسرار یس چہ باید کرد... ریاض الشعراء

کسی تذکرہ سے یہ پتہ نہیں چلتا ہے کہ اس نے شادی کی تھی۔ راقم حروف کا بھی خیال ہے کہ اس نے خود کو تجرد کی زندگی گذارنے پر مجبور کیا۔ معشوقوں کی بیوفائیوں نے اسکے دل پر ایسی ضرب لگائی کہ اسے معشوق مجازی سے ایک نفرت سی ہوگئی۔ کم ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ جو عین جوانی میں لباس فقر اختیار کرتے ہیں۔

شیخ سعدی کے متعلق مشہور ہے کہ اپنی زندگی کے اوائل میں تیس سال اس نے اکتساب علم میں گذارے اور تیس سال سیر و سیاحت میں اور زندگی کے آخری تیس سال گوشہ نشینی میں لیکن فقیر دہلوی نے عین جوانی میں دنیا اور دنیا کی نعمتوں سے کنارہ کشی اختیار کی۔ وہ ہر جزو کل میں خدا کا جلوہ دیکھتا تھا اور اس کا عقیدہ تھا کہ اللہ کے سوا کوئی شے ایسی نہیں ہے۔ جو قابل تعریف ہو کائنات کے ہر ذرہ میں خدا چھپا ہوا ہے پھر بھی انسان اسکو دیکھ نہیں پاتا لیکن جو لوگ نظر بینا رکھتے ہیں ان کو ہر چیز میں خدا ہی خدا نظر آتا ہے۔ فقیر دہلوی ایک ایسا مرد فقیر تھا جس نے علم و دانش سے ہی نہیں بلکہ عشق الٰہی سے خدا کی معرفت حاصل کی تھی۔ ذیل میں اس کے عقائد کے ثبوت میں چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

هر جزو و کلی که بود در افواه      برهان خداست پیش مرد آگاه
ترتیب مقدمات جسم و جان را      در منطق ما نتیجه باشد الله
در باطن هر ذره خدای دو جهان      عرشی دارد ز چشم ادراک نهان
در عشق تو عقل و هوس مجنون شد و رفت      صبر از دل بیقرار بیرون شد و رفت
غافل بد و نیک سنگ و گوهر بیند      عاشق همه جا جمال دلبر بیند
عارف آنست کو بهر چشم زدن      این عالم را عالم دیگر بیند

اس کی سیرت اور شخصیت کی عظمت و بزرگی کی وجہ سے آزاد بلگرامی والہ داغستانی، لچھمی نرائن شفیق، عبدالحکیم حاکم لاہوری، گلشن علی جونپوری عماد الملک اور بھگوان داس ہندی جیسے نامور لوگوں نے اس سے ملاقات کا



شرف حاصل کیا اور اس کی صحبت سے مستفیض ہوئے۔ نظام الملک آصف جاہ بھی فقیر دہلوی کو بہت عزیز رکھتا تھا اور وہ اس کے اخلاق کا گرویدہ تھا فقیر دہلوی نے نظام الملک آصف جاہ کی تعریف میں جو قطعہ لکھا ہے اس سے دو شعر ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

نظام الملک آصف جاہ غازی      پلنگ افگن امیر شیر صولت
بود ذات شریفش آیۂ خاص      کہ از غیب آمدہ در شان و شوکت،

فقیر دہلوی کے دیوان میں ایک قطعہ قزلباش خان امید سے متعلق ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ فقیر دہلوی روزانہ بلا ناغہ قرآن مجید کی تلاوت کرتا تھا وہ کلام پاک کی تلاوت کو مایۂ زندگی سمجھتا تھا۔ اسکا ایمان تھا کہ مسلمان کے دل کو کلام اللہ سے شفاء ملتی ہے اور یہی وہ کلام الٰہی ہے جو انسان کو زمانہ کی برائیوں سے بچاتا ہے آنحضرت صلعم نے بھی اپنے آخری خطبہ میں فرمایا تھا کہ مسلمانو! میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں۔ ایک قرآن اور دوسری حدیث، اگر تم ان دونوں پر چلوگے تو کبھی گمراہ نہ ہوگے

چونکہ فقیر دہلوی بلا ناغہ روزانہ تلاوت قرآن کرتا تھا اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک عالم ہی نہیں بلکہ عامل اور مرد کامل بھی تھا۔ دکن کے قیام میں اس کے پاس قرآن مجید نہیں تھا۔ جسکی وجہ سے اسکو بڑی پریشانی تھی اس لئے اس نے اپنے دوست اور ہم سفر قزلباش خان امید کی خدمت میں ایک قطعہ لکھ کر گذارش کی کہ اگر اس کے پاس کلام اللہ کا کوئی نسخہ ہے تو وہ اس نسخہ کو بطور انعام اس کے پاس بھیجدے اس کے عوض میں وہ اس کو دعائیں دیگا۔ جو شخص قرآن مجید کی تلاوت کا شیدائی ہو بلا شبہ اس کی سیرت اور شخصیت ایک عظیم شخصیت ہوگی فقیر دہلوی کے اس قطعہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کلام اللہ کی تلاوت روزانہ ہی نہیں بلکہ

---

سے دیوان فقیر - خدابخش لائبریری

[...] شب و روز کرتا تھا۔ اور قرآن مجید اسکی زندگی کا ایک جز تھا اگر اس کو (قرآن مجید) اسکی زندگی سے جدا کر دیا جاتا تو اس کی زندگی محال تھی۔ قرآن سے جیسا کہ اس نے اظہار کیا ہے اس کے دل کی آنکھوں کو سرمہ حاصل ہوتا تھا اور اسکے اوراق اس کی روح کیلئے آئینہ کا کام کرتے تھے۔ بلاشبہ فقیر دہلوی کا ظاہر و باطن روشن تھا ذیل میں اس قطعہ سے اس کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

در وطن بود زبس شوق تلاوت شب و روز — ہمچو سیپارۂ دل جز و حیاتم قرآن
پیش چشم دلم بود سواد مصحف — ورقش بود مرا آئینہ صورت جان
شدم از وطن آوارہ اقلیم دکہن — دربغل جز دل سیپارہ ندارم قرآن
گر بمن از کرم انعام کنی قرآنی — دارمش در بغل خویش حمایل چون جان
مایہ زندگی از پہلوی مصحف دارم — کار دل می کند اندر بغل من قرآن
از تو دل دادن و ازماست دعا بادم صدق — ہست سودای خوشی آں بدہ و این بستان

تا شفای دل مومن ز کلام اللہ است
از بد دہر نگہدار تو بادا قرآن

فقیر دہلوی کا دل حسد، بغض، اور کینہ سے پاک تھا اس دل میں خدا نہیں رہ سکتا جس دل میں بغض اور حسد ہو۔ فقیر دہلوی بلاشبہ ایک مرد عارف تھا ذیل کے شعر سے بھی اس بات کا ثبوت ملتا ہے

حسود از دین ندارد بہرہ ہر چند — بخود بند کمال از راہ تلبیس
حسد اول ز شیطان زاد از آزرو — بود حاسد بمعنی تخم ابلیس

فقیر دہلوی نے شیخ سعدی کی طرح کبھی کسی کی خوشامد نہیں کی اور اسکا یہ ایمان تھا کہ انسان کی خوشامد سے کچھ حاصل نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ اسکے دیوان میں ایک قصیدہ بھی نہیں ہے۔
اس سے پتہ چلتا ہے کہ قصیدہ گوئی کو وہ ناپسند کرتا تھا اور چونکہ اسکے دل



میں حب زر نہیں تھی اس لئے اس نے قصیدہ گوئی کو اپنا شعار نہیں بنایا۔
رضا قلی خان ہدایت نے بھی لکھا ہے کہ اکثر وہ درویشوں کی خدمت میں رہتا تھا۔ اور فقیروں کی صحبت نے ہی فقیر دہلوی کو مرد فقیر بنا دیا۔ اس نے دنیا سے اپنا رشتہ توڑ لیا تھا اور ظاہر و باطن میں طریقت اختیار کی تھی ذیل میں اس کا بیان نقل کیا جاتا ہے۔

"......... طالب خدمت درویشاں و غالب اوقات در صحبت ایشاں آخر الامر از برکت معاشرت ایشان بہ ترک علایق و عوایق دنیوی گفتہ ظاہراً و باطناً طریق طریقت پذیرفتہ بہ لباس فقر شدہ"[1]

فقیر دہلوی کے صاحب معرفت ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ مختلف تذکروں کے بیان سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے۔ فقیر دہلوی نے خود اپنے اشعار میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ ہر وہ شخص جو چار چیزوں کو حاصل کرے وہ خدائے تعالیٰ تک پہنچ جاتا ہے۔ اور اسے عرفان مل جاتا ہے۔ وہ چار چیزیں شب بیداری، فاقہ کشی، گوشہ نشینی اور خاموشی ہے۔ بلاشبہ سارے صوفیائے کرام نے انہیں چار چیزوں پر زیادہ زور دیا ہے اور یہی چار چیزیں معرفت حاصل کرنے کیلئے زینہ کا کام دیتی ہیں۔ حکیم سنائی، شیخ عطار، مولانا روم اور شیخ سعدی جیسے باکمال بزرگوں نے بھی ان چار چیزوں پر عمل کرنے کی دعوت دی ہے۔ عربی کے چند مقولے مشہور ہیں۔

(۱) قلیل الاکل کثیر الصحۃ۔ (خوراک میں کمی صحت کی دلیل ہے)
(۲) العزۃ فی العزلۃ۔ (گوشہ نشینی میں عزت ہے)
(۳) السلامۃ فی السکوت۔ (خاموشی میں سلامتی ہے)

---

[1] تذکرہ ریاض العارفین۔

ذیل میں فقیر دہلوی کے اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

ہر کس کہ چار چیز بود حسب حال او — رہ می برد بہارگہ حی لایموت
گر شرح آں چہار نخواہی بگویمت — بیداری و گرسنگی و عزلت و سکوت

بلاشبہ فقیر ایک بلند سیرت اور شخصیت کا حامل تھا۔ فقیر کے ذیل کی رباعی پر اس باب کا اختتام کرتا ہوں۔

زاں روز کہ با حسن تو کارم افتاد
فردوس ز چشم اعتبارم افتاد
عشق تو ہوا و ہوسم پاک بسوخت
برقی عجبی در خس خارم افتاد



# باب ٦

## فقیر دہلوی کی تصنیفات و تالیفات اور طرز نگارش

لذت سحر سخوری دہد شعر فقیر
تا زبانش وقف مدح حیدر کرار شد
(فقیر دہلوی)

# فقیر دہلوی کی تصنیفات و تالیفات اور طرزِ نگارش

فقیر دہلوی کے کلام پر محققانہ نظر ڈالنے سے پیشتر یہ لازم ہے کہ اس کے دیوان اور کلیات کے دستیاب نسخوں کا ذکر کر دیا جائے۔

راقم حروف نے اس کے دیوان اور کلیات کا کامل ترین نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں دیکھا اور مطالعہ کیا۔

(الف) **دیوان فقیر**:۔ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ میں کٹلاگ نمبر ۸۶۴ کے تحت دیوان فقیر کا ایک نسخہ ہے۔ لیکن اس میں صرف ۴۲ اوراق ہیں یہ نسخہ نامکمل ہے بلکہ اس کے دیوان کا ایک انتخاب ہے۔ راقم حروف نے اس نسخہ اور خدا بخش لائبریری کے نسخے کے اشعار سے مقابلہ کر کے اسکے اشعار کی تصحیح کی ہے سنہ کتابت اس نسخہ پر درج نہیں ہے۔

(ب) **انتخاب از کلام شمس الدین فقیر**:۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ کٹلاگ نمبر ۸۶۵۔ یہ نسخہ صحیح معنوں میں چند شعراء کے اشعار کا انتخاب ہے اس میں فقیر دہلوی کے کچھ اشعار درج ہیں اشعار کی ابتداء ذیل کے شعر سے ہوتی ہے۔

شد آن نیرنگ در رنگ جمال دلبران پیدا ۔ چو مضمونیکہ لطفش گردد از حسن بیان پیدا

(ج) **دیوان فقیر دہلوی**:۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ کٹلاگ نمبر ۶۸۲۔ اس نسخہ کے پہلے صفحہ پر ایک ضعیف العمر انسان کی تصویر روشنائی سے بنی ہوئی ہے اور اس میں ریش اور پگڑی بھی دکھائی گئی ہے۔ اس نسخہ کا سائز ۹×۵ ۳/۴، ۶×۳ ۱/۴ ہے



اس نسخہ کی کتابت ۱۲۴۱ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی ہے۔ نسخہ کے آخر میں ۲۶ ذیقعدہ ۱۲۴۱ھ لکھا ہوا ہے اسکے نیچے خالد شہاب الدین کا دستخط ہے غالباً خالد شہاب الدین ہی اس نسخہ کا کاتب ہے ورق ا (ب) سے غزلوں کی ابتداء بحساب حروف تہجی ہوئی ہے پہلا شعر یہ ہے۔

ای در طلب نام تو آوارہ نشانہا ۔ گم کردہ رہ معنی وصف تو بیانہا

اور اختتام اس شعر پر ہوا ہے۔

خود دلبراں دارد سری در پای عجزہا ۔ نیاز ماست پنداری فقیر آئینہ نازی

اس نسخہ میں غزل کے ۲۷،۰۰ اشعار ہیں سب سے پہلے غزلیں بحساب ردیف ہیں ذیل میں غزلوں کا شمار بحساب ردیف لکھا جاتا ہے۔

| | | |
|---|---|---|
| ردیف | الف | ۵۵ |
| ردیف | ب | ۵ |
| ردیف | ت | ۴۹ |
| ردیف | ث | ۱ |
| ردیف | ج | ۳ |
| ردیف | ح | ۱ |
| ردیف | خ | ۲ |
| ردیف | د | ۹۱ |
| ردیف | ذ | ۱ |
| ردیف | ر | ۱۰ |
| ردیف | ز | ۴ |
| ردیف | س | ۴ |
| ردیف | ش | ۱۲ |

| ردیف | ص | ۱ |
|---|---|---|
| ردیف | ض | ۱ |
| ردیف | ط | ۱ |
| ردیف | ظ | ۱ |
| ردیف | ع | ۱ |
| ردیف | غ | ۲ |
| ردیف | ف | ۲ |
| ردیف | ق | ۲ |
| ردیف | ک | ۲ |
| ردیف | ل | ۵ |
| ردیف | م | ۴۵ |
| ردیف | ن | ۲۹ |
| ردیف | و | ۹ |
| ردیف | ہ | ۱۱ |
| ردیف | ی | ۲۹ |

صفحہ ۱۰۸ سے رباعیاں شروع ہوئی ہیں رباعیوں کی تعداد ۱۲۵ ہے۔
پہلی رباعی ذیل میں نقل کی جاتی ہے۔

اسم اللہ کہ ہست سرمایہ جان　　جمع است درو تمام اسمای جہان
ہر چیز کہ باشدش بعالم نامی　　خود آن ہمہ حضرت مسمایش دان

چند لغز، معمات اور قطعہ تاریخ بھی ہیں۔
آخر میں ایک مثنوی "در تعریف دولت خانہ نواب سادات خان" ہے۔ کاتب نے غلطی سے سادات خان لکھدیا ہے۔ اصل میں سعادت خان ہونا



چاہئے۔ جو اودھ کا صوبہ دار تھا اس نسخہ کی کتابت معمولی نستعلیق میں ہے اور نسخہ بہت قدیم ہے کیونکہ اس پر ۱۲۴۱ھ لکھا ہوا ہے۔ گویا یہ نسخہ فقیر دہلوی کی وفات کے کل ۵۸ سال بعد لکھا گیا اور اس نسخہ میں کل تین ہزار چار سو باسٹھ (۳۴۶۲) اشعار ہیں۔

اس کے دیوان کے سادے نسخوں میں یہ نسخہ قدیم ترین اور نادر ترین نسخہ ہے یہی وجہ ہے کہ راقم حروف کو فقیر دہلوی پر تحقیقی مقالہ لکھنے کا شوق دامنگیر ہوا۔

(د) <u>کلیات فقیر دہلوی</u>، خدا بخش لائبریری کٹلاگ نمبر ۱۸۱/۱
اسکی کتابت واضح اور روشن ہے صفحہ اول پر ذیل کی عبارت مرقوم ہے۔

"نسخہ ھذا بعد شوق الاحلسے دعیرے سید وحید الدین احمد ولد سید قائم علی ساکن دمالک موضع سید شاہ"

اس نسخہ کی ابتدا ذیل کے شعر سے ہوئی ہے۔

ای در طلب نام تو آوارہ نشانہا　　گم کردہ رہ معنی وصف تو بیانہا

اس نسخہ میں کچھ غزلیں ایسی ہیں جو دیوان میں نہیں ہیں راقم حروف نے دونوں نسخوں کا مقابلہ کرکے اسکی غزلوں کی تصحیح کی ہے۔ اسکے علاوہ دیوان میں جو ترجیع بند، رباعیات، قطعات اور مثنویاں ہیں انکی بھی تصحیح کی ہے۔

اس نسخہ کی غزلیں بحساب حروف تہجی ہیں۔ جابجا حاشیہ میں بھی خط شکستہ میں اشعار مرقوم ہے بہت سے اوراق نمی کی وجہ سے بدرنگ ہوگئے ہیں اس لئے ان اوراق کے حروف غیر واضح ہیں خصوصاً حاشیہ کے۔ سنہ کتابت اور کاتب کا نام مرقوم نہیں ہے لیکن حاشیہ کی سنہری لکیر اور طرز تحریر سے واضح ہوتا ہے کہ نسخہ قدیم ہے۔ اس نسخہ میں سب سے پہلے غزلیں ہیں جن کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

| ردیف | الف | ۵۰ |
|---|---|---|

| | | |
|---|---|---|
| ردیف | ب | ٣ |
| ردیف | ت | ٢٩ |
| ردیف | ث | ١ |
| ردیف | ج | ٢ |
| ردیف | ح | ١ |
| ردیف | خ | ١ |
| ردیف | د | ٤٤ |
| ردیف | ذ | × |
| ردیف | ر | ٧ |
| ردیف | ز | ٣ |
| ردیف | س | ٣ |
| ردیف | ش | ١١ |
| ردیف | ص | ١ |
| ردیف | ض | ١ |
| ردیف | ط | × |
| ردیف | ظ | × |
| ردیف | ع | ١ |
| ردیف | غ | ٢ |
| ردیف | ف | ٢ |
| ردیف | ق | ١ |
| ردیف | ک | ١ |
| ردیف | ل | ٧ |
| ردیف | م | · |
| ردیف | ن | ١٤ |
| ردیف | و | ٣ |
| ردیف | ہ | ٦ |
| ردیف | ی | ٣٤ |

اوراق کے نمبر شمار بے ترتیب ہیں۔

اس نسخہ میں رباعیوں کی تعداد ٤٦ ہے۔ رباعی کے بعد مثنوی "در تعریف دولتخانہ نواب امیر الامرا، سادات خان بہادر دام ظلہ"⁽¹⁾ ہے ورق ایکسو دس(١١٠) سے "مثنوی مسمی بتصویر محبت" شروع ہوتی ہے۔ اس مثنوی کا پہلا شعر یہ ہے۔

خداوندا دلی دہ شعلہ سانم     کہ از سوزش نقد آتش بجانم

ورق ١١٠(ب) سے ورق ١٣٤(الف) تک یہ مثنوی ہے اور اس میں ٥٨٤ اشعار ہیں۔ اس مثنوی کے بعد "مثنوی در واقعہ جانسوز کربلا" شروع ہوئی ہے اسکا پہلا شعر یہ ہے۔

باز از ماہ محرم در جہاں     تازہ شد داغ مصیبت دوستاں

اس میں کل ۹۱ اشعار ہیں۔ اسکے بعد مثنوی "در تعریف خسخانہ" شروع ہوتی ہے اس نسخہ میں ١٥١ ورق اور کل اشعار کی تعداد دو ہزار نو سو نوے (٢٩٩٠) ہے۔

برٹش میوزیم لائبریری لندن اور بوڈلین لائبریری میں دیوان یا کلیات فقیر دہلوی کا کوئی نسخہ نہیں ہے۔

(١) مثنوی در تعریف دولتخانہ نواب امیر الامرا، سادات خان بہادر اس مثنوی کی ابتداء ذیل کے شعر سے ہوئی ہے۔

دگر بر روی طبع نکتہ پرواز     دری گردیدہ از فیض سخن باز

کاتب نے غلطی سے "سادات خان" لکھدیا ہے حالانکہ سعادت خاں

ہونا چاہئے کیونکہ سادات خان نام کی کوئی مشہور شخصیت نہیں ہوئی ہے۔ البتہ سعادت خاں نیشاپوری صوبہ دارِ اودھ سے فقیر کے اچھے تعلقات تھے اس لئے یقیناً یہ مثنوی انہیں کی مدح میں ہے۔ سعادت خان نیشاپوری کی سوانح حیات راقم حروف نے "احوال معاصرین" کے باب میں قلمبند کیا ہے اسلئے اس جگہ اسکی حاجت نہیں۔ یہ مثنوی ایک گراں بہا سرمایہ ہے جس سے نواب سعادت خاں نیشاپوری کے اوصاف حمیدہ پر روشنی پڑتی ہے۔

## ۲۔ مثنوی تصویر محبت

اس مثنوی میں ایک پان فروش کے بیٹا رام چندر سے عشق و محبت کا ذکر ہے اشعار میں بڑی لطافت اور دلکشی ہے۔ سادگی اور حسن ترتیب کے زیور سے آراستہ ہے۔ اشعار کے انداز بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فقیر دہلوی کو اس پان فروش کے بیٹا رام چندر سے والہانہ عشق تھا۔ ورنہ جو جوش اور لطف ان اشعار میں ہیں وہ عشق کے جذبہ کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتے

والہ داغستانی نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے کہ فقیر دہلوی اپنی جوانی کے اوائل میں عاشق مزاج تھا اور کبھی ایک معشوق تو کبھی پانچ چھ معشوقوں سے اسکا رابطہ تھا۔

"میر عالیجناب ہرگز بے شور محبتی و بے جذبۂ عشقی نمی باشد وگاہ ہست کہ با پنج شش معشوق سروکار دارد وگاہ تخمینہ دارد بہ یک کس قناعت می فرمایند"[۱]

اس مثنوی کا آغاز ذیل کے شعر سے ہوتا ہے

خداوندا دلی دہ شعلہ سانم ۔۔۔ کہ از سوزش فتد آتش بجانم

---

[۱] ریاض الشعراء ص ۲۱۴



یہ نسخہ خدا بخش لائبریری میں نہایت خستہ حالت میں ہے۔ ابتدا میں حمد و نعت اسکے بعد عشق کی صفتوں کا ذکر ہے۔ رام چندر کے حسن کی بیحد تعریف کی گئی ہے اس کے بعد رام چندر کے شادی کا قصہ ہے۔ رام چندر گنگا ندی میں غسل کیلئے گیا اور اس کی شریک حیات حریفوں کے ہاتھوں ہلاک ہو گئی اس کی دلہن کی نعش جلائی گئی۔ رام چندر کو اپنی دلہن کے مرنیکا بہت صدمہ ہوا۔ جسکی وجہ سے وہ مجنون ہو گیا اور مثل دیوانہ صحرا بصحرا پھرتا رہا۔ کبھی جنگل میں ہرنوں سے وہ باتیں کرتا تو کبھی بادلوں کو خطاب کرتا۔ غرضکہ اس کی زندگی کے دن جنون کی حالت میں گذر رہے تھے۔ آخر اس صدمہ جانکاہ کی تاب نہ لا سکا اور اپنی جان ہلاک کر دی۔ فقیر دہلوی نے بعدہ خود کو خطاب کیا ہے۔ اور رام چندر سے اسکے جو والہانہ تعلقات تھے اس کو ظاہر کیا ہے۔ اشعار میں تصوف، درد اور سوز سب ساتھ ہی ساتھ رنگ تغزل بھی پایا جاتا ہے آخر میں مناجات پر خاتمہ ہے۔

یہ مثنوی عشقیہ داستان کی ایک نہایت گرانقدر مثنوی ہے اس کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ فقیر دہلوی کو عاشقانہ خیالات اور جذبات عشق اظہار کرنے میں مہارت حاصل تھی۔ وہ صرف صوفیانہ خیالات ہی کو پیش نہیں کرتا تھا بلکہ مولانا جامی کی طرح واردات عشق سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔ مثنوی نگاری کیلئے حسن ترتیب سب سے بڑی شے ہے اسکے بعد واقعہ نگاری۔ فقیر دہلوی حسن ترتیب اور واقعہ نگاری میں ممتاز مقام پر نظر آتا ہے وہ واقعات کے جزئیات کو ترتیب کے ساتھ پیش کرنے میں مہارت رکھتا تھا۔ بلاشبہ اس کی یہ مثنوی ایک گرانقدر عشقیہ مثنوی میں شمار کی جا سکتی ہے۔

## (۳) مثنوی در واقعہ جہان سوز کربلا

فقیر دہلوی کو شہدائے کربلا سے ایک والہانہ عشق تھا کیونکہ وہ مرد عارف اور مرد فقیر تھا۔ اس مثنوی میں اس نے ریگ زار کربلا کے واقعات نہایت

پُر درد انداز میں بیان کئے ہیں کوئی پڑھنے والا اثر لئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ راقم حروف نے جب مثنوی کا گہرے طور پر مطالعہ کیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو کے قطرے ڈھلکنے لگے۔ کربلا کا واقعہ کوئی ایسا واقعہ نہیں ہے جو پتھر دل انسان پر بھی اثر نہ ڈالتا ہو۔ خاندان نبوت کے جانباز اور شیدائی افراد نے کسطرح بے سروسامانی کے عالم میں بیابان میں دن اور راتیں گذارین اس مثنوی کو پڑھنے سے یہ ساری باتیں روشن ہو جاتی ہیں۔ فقیر دہلوی نے گردوپیش کے ہر واقعہ کو نہایت موثر انداز میں قلمبند کیا ہے۔ اہل بیت کس طرح کربلا میں داخل ہوئے خیموں کا نصب ہونا یزید کی فوج کا خیموں کے نصب میں مانع ہونا۔ محرم الحرام کی سات تاریخ سے اہل بیت پر پانی کی بندش، ابن زیاد کا قاصد کے ذریعہ حضرت امام حسینؓ کو یزید کی بیعت کیلئے مجبور کرنا۔ حضرت امام حسینؓ کا بیعت سے انکار کرنا۔ اور موت کو حیات پر ترجیح دینا۔ بے سروسامان قافلہ کے بے قصور افراد کا شہید ہونا، خیموں کو لوٹنا۔ آگ لگانا۔ عورتوں اور بچوں کو قیدی بنانا۔ یہ سارے واقعات نہایت پُر درد انداز میں بیان کئے ہیں اور پڑھنے والا ریگ زار کربلا میں اپنے کو کھڑا محسوس کرتا ہے اور اسکی آنکھوں کے سامنے تمام واقعات رونما ہو جاتے ہیں چونکہ فقیر دہلوی کو واقعہ گوئی پر قدرت حاصل تھی اسلئے واقعہ کی تصویر کشی نہایت حقیقی انداز میں کی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فقیر دہلوی اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس مثنوی کا آغاز ذیل کے شعر سے ہوتا ہے۔

باز از ماہ محرم درجہان      تازہ شد داغ مصیبت دوستان

(۴) دُرِ مکنون

فقیر دہلوی نے اس مثنوی میں قیصر روم کی صاحبزادی برجیس خاتون کے حالات قلمبند کئے ہیں جنہیں ملیکہ بھی کہا جاتا تھا۔ یہ بات مشہور ہے کہ انہوں نے خواب دیکھا تھا اور اسی وجہ سے وہ سرزمین عراق پر پہنچیں جہاں ان کی



شادی امام حسن عسکری سے ہوئی فقیر دہلوی نے اس قصہ کو بڑی عقیدت کے ساتھ پیش کیا ہے اس مثنوی کے دو حصے ہیں پہلے حصہ میں حمد و نعت کے بعد بارہ اماموں کی منقبت بھی ہے پہلے حصہ میں ۹۸ اوراق ہیں ہر صفحہ میں ۱۸ اشعار ہیں۔ برجیس خاتون اور حضرت امام حسن عسکری کا قصہ ورق ۳۳ سے ۸۷ تک ہے۔ اس کے بعد امام ثانی عشر صاحب العصر والزمان خلیفۃ الرحمان صلوٰۃ اللہ علیہ کی ولادت باسعادت کا بیان ہے پھر غزل کے کچھ اشعار ہیں آخر میں "حکایت ابو سعید خاتم ہندی ورسیدن او در حضور امام ثانی عشر صاحب العصر والزمان صلوات اللہ والسلام ورغبت صغری بر طبق روایت اصول کافی کے عنوان سے حکایت ہے اس نسخہ کے اختتام پر مرقوم ہے دیوان شمس الدین فقیر قلمی فارسی از کتب خانہ حسنات نواب حاج سید ولایت علی خان بہادر، اور ذیل کی دو مہریں ثبت ہیں۔

| از کتبخانہ سید ولایت علی خان | خورشید نواب ۱۲۲۸ |
| --- | --- |

اس نسخہ کے دوسرے حصہ کے آغاز میں بھی مندرجہ بالا عبارت اور مہریں ہیں دوسرے حصہ میں ۱۲۶ اوراق ہیں سب سے پہلے "توحید سبحانہ" اس کے بعد فی نعت المرسلین خاتم الانبیاء محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ والہ وسلم پھر علی ابن ابی طالبؓ کی منقبت اور مدح وسلام بعدہٗ اماموں کی مدح اور منقبت میں ۵۲ اوراق ہیں اس کے بعد حضرت علیؓ کی منقبت میں اشعار ہیں ورق ۵۵ سے غزلوں کے اشعار ہیں۔ ان غزلوں کے اشعار کی تعداد ۱۲۰۰ ہے یہ غزلیں راقم حروف نے فقیر دہلوی کے دیوان میں بھی دیکھیں اور دیوان کی مرقومہ غزلوں سے مقابلہ کیا۔

اس نسخہ میں جس کا کٹلاگ نمبر ۶۰۹ ہے کل اشعار کی تعداد تقریباً چار ہزار ہے۔ فقیر دہلوی نے یہ مثنوی ۱۱۶۹ھ میں لکھی۔

## (۵) مثنوی شمس الضحیٰ

کٹلاگ نمبر ۲۵۳، ۶ خدابخش لائبریری۔ اس مثنوی کے دو نسخے خدابخش لائبریری میں ہیں۔ کٹلاگ نمبر ۲۵۳، ۶ کا آغاز ذیل کے شعر سے ہوا ہے۔

ای بنام تو زبان سحر طراز نطق کا داد مایۂ اعجاز

۳۶ اشعار کے بعد "در توحید باری تعالیٰ شانہ" حمد ہے جس کا آغاز ذیل کے شعر سے ہوا ہے۔

حمد بیحد خدای واحد را کوست در خور ہمہ محامد را

ورق ۱۶ سے نعت شروع ہوئی ہے ایک شعر ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

انبیاء جملہ پیکار انش اولیاء از وظیفہ خور انش

اسکے بعد حضرت علیؓ کی منقبت میں اشعار ہیں دو شعر ملاحظہ ہوں۔

آن علی یار کار پیغمبر آنکہ مارا از وست چشم نظر

آن نمائندہ رہ ایمان آن کشائندۂ در عرفان

مثنوی شاعرانہ محاسن سے آراستہ ہے۔ حسن ترتیب، واقعہ نگاری اور جذبات نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔ ساتھ ہی ساتھ سادگی میں شیخ سعدی اور جامی کے مثل ہے سال تصنیف ۱۱۷۳ھ ہے۔

## (۶) مثنوی تحفۃ الشباب

فقیر دہلوی نے اس مثنوی کو ۱۱۳۳ھ میں پایۂ تکمیل تک پہنچایا یہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہوتا ہے اس کی جوانی کا تحفہ ہے۔ اس وقت فقیر کی عمر ۲۸ سال تھی شاعرانہ محاسن سے لبریز اور اپنے اندر ایک کشش اور اثر رکھتی ہے۔



## (۷) مثنوی والہ وسلطان

(الف) کٹلاگ نمبر ۱۳۴ خدابخش لائبریری پٹنہ، اوراق ۱۹۱، سطور ۱۷، سائز ۳×۴ ۵½×۸ یہ مثنوی والہ داغستانی اور خدیجہ سلطان کے عشق کی پُر درد داستان ہے۔ والہ کو اپنی چچیری بہن خدیجہ سلطان سے والہانہ عشق تھا دونوں کو بچپن ہی میں منسوب کر دیا گیا تھا۔ لیکن دونوں کی شادی نہ ہو سکی اس ناکام محبت کی داستان کو فقیر دہلوی نے نہایت دلکش انداز میں ۱۱۶۰ھ میں لکھا۔

نسخہ کا آغاز ذیل کے شعر سے ہوا ہے۔

ای والہ حسن دلکشت جان عشق تو بہر دو کون سلطان

مسٹر بلوک مین ... نے اس نسخہ پر ۱۸۷۰ء میں دستخط کیا ہے جو اب تک موجود ہے کل اشعار کی تعداد تین ہزار دو سو ہیں ۳۲۳۰ فقیر دہلوی نے اپنے ذیل کے شعر میں بھی اس بات کا اظہار کیا ہے۔

باشد چو شمار اہل معنی بیتش سہ ہزار دو صد و سی

یہ مثنوی ۱۱۶۰ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ فقیر دہلوی نے اختتام میں اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ اس کی یہ مثنوی دوسری مثنویوں سے بہتر ہے۔ کیونکہ اس کی داستان اختراعی یا افسانوی حیثیت نہیں رکھتی ہے۔ بلکہ حقیقت کا اظہار ہے فقیر دہلوی نے ذیل کے اشعار میں اس مثنوی کا مقام واضح کیا ہے۔

این نظم ز نظمہای دیگر از چند جہت بود نکوتر

اول آنست کاین حکایت منقول نگشتہ از روایت

نبود چو حکایت سماعی یا ہمچو فسانہ اختراعی

---

نسخہ والہ وسلطان مطبوعہ ص ۱۹۲۔

وقیر دہلوی کے ذیل کے اشعار میں اس مثنوی کی تاریخ پوشیدہ ہے۔

آمد چو بدل خیال تاریخ | شد نظم ضیع سال تاریخ ۱۱۶۰
تاریخ دگر ز "شخص معنی" ۱۱۶۰ | ظاہر شود ت اگر بجوی

(ب) نسخۂ قلمی والہ دسلطان۔ کتابخانہ آقای جعفر سلطان القرائی تبریز

استاد محترم ڈاکٹر عبد الغفار انصاری نے آقای جعفر سلطان القرائی سے تہران میں ملاقات کا شرف حاصل کیا اور اس نسخہ سے استفادہ کرنے کا اظہار کیا۔ مالک کتبخانہ نے جب انھیں تبریز جانے کا موقع ملا۔ اس نسخہ کو اپنے ساتھ تہران لایا۔ ڈاکٹر عبد الغفار انصاری کا بیان ہے کہ اس نسخہ کو دیکھکر انہیں بیحد خوشی ہوئی کیونکہ انکی آنکھوں کے سامنے پہلی بار والہ داغستانی اور خدیجہ سلطان کی تحریریں، مہر کے ساتھ آئیں۔ انھوں نے چند صفحات کا عکس بھی حاصل کیا جن پر خدیجہ سلطان اور والہ داغستانی کی تحریریں مع مہر ہیں۔

محمد رضا اس نسخہ کا کاتب تھا۔ اور اس نے سنہ ۱۱۶۰ھ میں یکم جمادی الآخر کو شہر شاہجہان آباد میں اس نسخہ کی کتابت کو پایۂ اختتام تک پہنچایا تھا۔ صفحہ اول پر تین مہریں ہیں۔ دو علی قلی خان والہ داغستانی کی ہیں اور ایک مہر میں "یا امیر المومنین" لکھا ہوا ہے۔ چند رباعیات بھی والہ داغستانی نے بقلم خود لکھی ہیں اور یہ شعر بھی مرقوم ہے۔

کہنہ شد قصۂ مجنون حدیث درد من بشنو
بہر افسانہ عمر خود مکن ضائع سخن بشنو

ایک گوشہ میں ذیل کی تحریر بھی مرقوم ہے۔

"تا غرہ شہر ذی قعدہ سنہ ۱۱۶۱ھ دور از تو علی قلی روسیاہ

---

لہ احوال و آثار و افکار علی قلی خان والہ داغستانی ص ۳۰۴، ۳۰۵۔



زندہ ماندہ است لہ"

اس صفحہ کے بالائی حصہ پر ترکی زبان میں یہ تحریر درج ہے۔

"خدیجہ سلطان جانم سنکا تصدق کیتم مین لہ"

والہ داغستانی کی ایک مہر کی نقل ذیل میں ملاحظہ ہو۔

دوسری مہر اسطرح ہے۔

۱۱۵۹
خان بہادر علیقلی داغستانی عباسی

بائیں جانب یہ شعر مرقوم ہے۔

نامہ نخویستن ست کہ تا بم نیست | نامۂ غیر ازیں کتابم نیست

صفحہ دوسرے صفحہ انچاس لہ تک والہ داغستانی نے اپنے اشعار کو بخط خود لکھا ہے۔ صفحہ انچاس پر بھی والہ داغستانی کی ایک مہر اور چار مہریں خدیجہ سلطان کی ہیں۔ خدیجہ سلطان نے اپنی تین رباعیاں بھی بخط خود لکھی ہیں جو ذیل میں مرقوم ہیں۔

---

لہ بخط والہ داغستانی لہ اے خدیجہ سلطان میری جان تجھ پر قربان ہو جائے۔

صفحہ ایک سو چوالیس ۱۴۴ پر پانچ مہریں ہیں۔ دو مہر والہ داغستانی کی اور دو مہریں اسی جو ذیل میں درج ہیں۔

> ۱۱۵۱
> یا امیر المومنین

پانچویں مہر خدیجہ سلطان کی ہے۔ ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔

> ۱ اللہ ۱۱۵۹
> بملک شہر دیا شد ز فضل ... سلطان
> خدیجہ بنت حسن افتخار داغستان

یہ نسخہ تقریباً تیس سال سے آقای جعفر سلطان القرائی تبریزی کے کتابخانہ میں ہے۔ اور اسکی حالت اچھی ہے مجلد اور کاغذ فرنگی ہے عام طور پر ہر سطر میں بارہ اشعار ہیں۔ سائز اسکا ۱۰ × ۶ ہے۔

(ج) نسخہ قلمی والہ و سلطان: مرزا محمد اور سی اسپرنگ رائس، لندن

پٹنہ یونیورسٹی لائبریری میں ایک مطبوعہ کتاب بزبان انگریزی ہے جس کا نام "The Story of Valeh and Hadijeh" اسکا کٹلاگ نمبر ۲۸۴ ہے یہ کتاب مثنوی والہ و سلطان کا انگریزی ترجمہ ہے اور لندن میں ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی۔ صفحات کی تعداد ۱۳۲ ہے۔

مرزا محمد اور سی اسپرنگ رائس نے مثنوی "والہ و سلطان" کا ترجمہ بزبان انگریزی ایک نادر نسخہ "والہ و سلطان" سے کیا۔ ایک دن اتفاقیہ مرزا محمد کو "والہ و سلطان" کا نسخہ لندن میں کہیں مل گیا جس کا کاتب



محمد رفیع[1] ہے اور ۱۱۶۳ھ میں اس نے اسکی کتابت کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا تھا۔ اس نسخہ کے مختلف اوراق پر بہت سی مہریں ہیں جن میں خدیجہ سلطان اور والہ داغستانی کی مہریں بھی ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ نسخہ والہ داغستانی اور خدیجہ سلطان کی ملکیت میں رہا ہوگا۔ لیکن اب یہ نسخہ کہاں ہے کچھ پتہ نہیں ممکن ہے لندن کے کسی کتابخانہ میں ہو۔ سی اسپرنگ رائس نے مرزا محمد کی فرمائش پر اس نسخہ کا ترجمہ بزبان انگریزی کیا تھا۔ اس ترجمہ کی وجہ سے انگریزی جاننے والے خدیجہ سلطان اور والہ داغستانی کے معاشرہ سے باخبر ہوئے۔

راقم حروف نے مثنوی "والہ و سلطان" کا ایک نسخہ رضا لائبریری رام پور، لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری میں بھی دیکھا۔ اور ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن[2] میں بھی ہے۔

(۸) خلاصۃ البدیع: کٹلاگ نمبر ۸۲۰، خدابخش لائبریری پٹنہ اس نسخہ کے پہلے صفحہ پر دو مہریں ہیں۔ ایک مہر نواب خورشید کی ۱۲۸۰ھ کے ساتھ ہے۔ اور دوسری مہر اس طرح ہے۔

> ۱۲۹۰
> از کتابخانہ سید ولادت
> علی خان

اس نسخہ کے دو حصے ہیں ایک حصہ ورق ۱۳ تک ہے اور صنائع

---

[1] محمد رفیع اپنے زمانے کا ایک نامور کاتب تھا جسکے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک قلمی نسخہ "دیوان والہ داغستانی" رضا لائبریری رامپور میں ہے اس نسخہ پر بھی ۱۱۶۳ھ لکھا ہوا ہے۔

[2] کٹلاگ انڈیا آفس لائبریری جلد اول ص ۹۲۸

ابواب پر مشتمل ہے۔ ورق ۱۴ خالی ہے۔ پھر ورق ۱۵ سے ورق ۱۳۲ تک دوسرا حصہ ہے جو علم عروض و قوافی سے متعلق ہے اس نسخہ کے اختتام میں بھی وہی مندرجہ بالا مہریں ثبت ہیں۔ ان دونوں رسالوں میں فصاحت و بلاغت کمال پر ہے۔ صنائع و بدائع لفظی و معنوی کو نہایت دلکش انداز میں قلم بند کیا ہے رسالہ کی ابتداء اس طرح ہوئی ہے۔

"سبحان اللہ من ناقصر راکہ عزلی مثال بہ صیغۂ ہیچ مدانی صرف ملازمت اہل معصفہ مصدر حمد و ثنای متکلمی باید شد کہ اہل کمال با... ی صحیح ہر چند در بیان می آید"

اس رسالہ کی تالیف کے سلسلہ میں فقیر دہلوی کا بیان قلم بند کیا جاتا ہے۔

"اما بعد۔ بندہ معترف بتقصیر شمس الدین فقیر این چند کلمہ در بیان صنائع و محسنات شعر از مفتاح سکاکی و مطول علامہ تفتازانی اقتباس نمودہ بر سبیل ایجاز و اختصار گذارش می نماید. . . . . .
. . این مختصر مشتمل بر مقدمہ و دو فصل و خاتمہ است"

فقیر دہلوی نے اس حصہ میں فصاحت و بلاغت کے فن کو بھی اچھی طرح سمجھایا ہے۔ اسکے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ فقیر دہلوی کو علم بدیع میں بھی مہارت حاصل تھی اور وہ چاہتا تھا کہ شعر اپنے محاسن کے اعتبار سے ناقص نہ ہو۔

اس نسخہ کا دوسرا حصہ علم العروض اور قافیہ کے سلسلہ میں ہے اس حصہ میں فقیر دہلوی نے علم عروض اور دستور شعر سے متعلق نہایت بسیط اور مدلل باتیں کی ہیں۔ انداز تحریر نہایت سہل اور آسان ہے۔ یہ کتاب شعراء کیلئے راہنما ہے۔ اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ فقیر دہلوی نے اس کو نہایت سادہ طریقہ پر سمجھانے کی کوشش کی ہے اور اپنے اس فرض میں بہت



حد تک کامیاب نظر آتا ہے۔ یوں تو فن شاعری سے متعلق بہت سی کتابیں وقتاً فوقتاً لکھی گئیں جن کی تعداد بہت زیادہ ہے مصنف دیباچہ میں متداولہ سے ان کتابوں کے نام لکھے ہیں۔ لیکن فقیر نے اس کتاب کو قدیم مشہور کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد لکھا ہے اور قدیم کتابوں سے استفادہ کیا ہے اس لئے یہ کتاب بہت سہل بن گئی ہے

(۹) حدائق البلاغت، کیٹلاگ نمبر ۳۰۱۷، خدا بخش لائبریری پٹنہ۔

یہ کتاب ۱۱۹ صفحات پر مشتمل ہے جسے میر شمس الدین فقیر نے لکھا ہے اس میں فن بلاغت اور اس کے اصولوں پر بحث کی گئی ہے۔ مصنف نے نہایت آسان زبان میں اصول بلاغت کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ تاکہ شعراء اس سے استفادہ کر سکیں اس کتاب میں پانچ حدیقہ اور خاتمہ ہے حدیقۂ اول علم بیان سے متعلق ہے۔ حدیقۂ دوم علم بدیع۔ حدیقۂ سوم علم عروض۔ حدیقۂ چہارم علم قوافی، اور حدیقۂ پنجم فن معما سے متعلق ہے۔ اس کے بعد خاتمہ اور سرقات شعریہ۔ اس کتاب کے آخر میں ذیل کی تحریر نقل ہے۔

"دہم شہر محرم الحرام سنہ ۱۲۴۰ ہجری است نسخہ ہذا مسمی"...

بہت ممکن ہے کہ اس نسخہ کی کتابت سنہ ۱۲۴۰ھ میں ہوئی ہو کیونکہ یہ نسخہ نہایت خستہ حالت میں ہے اور بڑی محنت سے اسے اس لائق بنایا گیا ہے کہ قارئین اسے پڑھ سکیں۔ جا بجا دیمکوں نے اوراق کو اپنی غذا بنایا ہے اس لئے کئی صفحات ضائع ہو چکے ہیں۔

اس نسخہ کے مطالعہ سے یہ روشن ہے کہ فقیر صرف ایک ممتاز شاعر ہی نہیں تھا بلکہ فن عروض و بلاغت میں ایک کامل استاد تھا۔ اس لئے اس کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

(۱۰) رسالہ در علم بیان۔ کیٹلاگ نمبر ۳۰۸/۱۲ خدا بخش لائبریری پٹنہ۔

راقم حروف نے اس نسخہ کو خدا بخش لائبریری میں بہت تلاش کیا لیکن یہ نسخہ گم ہو گیا ہے۔ کیٹلاگ خدا بخش جلد سوم صفحہ ۱۵۲ پر سابق کیٹلاگر المہر شیر نے لکھا ہے کہ یہ میر شمس الدین فقیر کی تصنیف ہے۔ اس نسخہ کا کاتب عباد الدین ہے جس نے ۱۱۶۵ھ میں اس کی کتابت کی تھی۔ اس وقت فقیر دہلوی بھی زندہ تھا۔ اس اعتبار سے یہ نسخہ بہت اہم ہے۔ کیونکہ اس کی کتابت فقیر دہلوی کی حیات میں ہوئی۔ لیکن نہایت افسوس ہے کہ باوجود تلاش و سعی کے یہ نسخہ کسی دوسرے کتابخانہ میں بھی نہیں مل سکا۔ فقیر نے یہ کتاب علم بیان پر لکھی ہے اور کل ۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اگر کتاب کا کوئی نسخہ مل جاتا تو اس پر تفصیلی تبصرہ کیا جا سکتا۔ لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ فقیر علوم شاعری سے اچھی طرح واقف تھا اس لئے اس نے اس کتاب کو ضرور بہتر طور پر لکھا ہوگا۔



# فقیر دہلوی بحیثیت شاعر

فقیر دہلوی مغل عہد کا ایک ممتاز شاعر اور صوفی تھا۔ لیکن فارسی شعر و سخن سے دلچسپی رکھنے والے بیشتر صاحبان اس سے ناواقف ہیں۔ کیونکہ فارسی شعر و شاعری پر ہندوستان اور ایران میں جو کتابیں تصنیف ہوئیں ان میں آخری مغل دور کے شعراء کا ذکر نایاب ہے۔ مصنفوں اور تذکرہ نگاروں نے زیادہ تر انہیں شعراء کے احوال و افکار قلم بند کئے ہیں جنکے حالات زندگی اور اشعار باسانی دستیاب ہوئے۔ چونکہ فقیر دہلوی کی زندگی اور شعر و شاعری سے متعلق باتیں قلمی نسخوں میں دستیاب ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ دو چار نسخوں کے مطالعہ سے احوال و افکار پورے طور پر روشن نہیں ہوتے اس لئے فقیر کی زندگی اور شاعرانہ محاسن پر ایک گہرا پردہ پڑا ہوا ہے۔ راقم حروف نے حتی المقدور محنت سے اس باکمال صوفی اور عاشق مزاج شاعر کے اشعار کو فراہم کیا اور اس کی شاعری پر روشنی ڈالی ہے۔

فقیر دہلوی کے حالات کے سلسلہ میں اس کے دوست والہ داغستانی نے لکھا ہے کہ فقیر دہلوی اپنے حالات کو عوام سے چھپاتا تھا اور شہرت سے بھاگتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی زندگی کے حالات اور کارنامے پوشیدہ رہے ورنہ خان آرزو جیسے ناقد کا بیان ہے کہ اس عہد میں فقیر دہلوی جیسا شاعر

ریاض الشعراء

ہندوستان میں نہیں تھا۔ اور اس نے دعا دی ہے کہ خدا اس کو سلامت رکھے۔ راقم حروف کا خیال ہے کہ خان آرزو نے اپنے دوستانہ تعلقات کی وجہ سے فقیر دہلوی کی تعریف میں کچھ مبالغہ سے کام لیا ہے یہ بات صحیح نہیں ہے کہ اس وقت ہندوستان میں فقیر جیسا باکمال شاعر نہیں تھا۔ اگر غور کیا جائے تو شیخ حزیں اس دور میں ہند و ایران میں فارسی کا سب سے بڑا شاعر تھا۔ اور اس وقت وہ ہندوستان ہی میں تھا۔ لیکن چونکہ شیخ حزیں سے آرزو کے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ اس لئے آرزو نے اس کی وہ تعریف نہیں کی جس کا وہ مستحق تھا۔ آرزو کے بیان کے مطابق فقیر ... شاعری اور فضل و کمال میں یکتائے روزگار تھا۔ ذیل میں خان آرزو کی تحریر نقل کی جاتی ہے۔

"خداش سلامت دارد کہ امروز مثل او در ہند نیست ........

"فضل و کمال و شعر و انشا و فنون دیگر مثل عروض قافیہ و معانی و بیان و بدیع یکتائے روزگار و منتخب لیل و نہار است"۔[1]

والہ داغستانی نے فقیر دہلوی کی شاعری کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

"افاضل زمان و اسوۂ سخنوران جہانست ........ عجوبۂ زمان و نادرۂ دوران"۔[2]

آزاد بلگرامی جیسے باکمال نقاد نے فقیر دہلوی کی تعریف ذیل کے الفاظ میں کی ہے۔

"باعتبار سرمایۂ استعداد خداداد از اغنیاء زمان است۔ در فضل و کمال شعر، انشا و معانی و بیان و بدیع و عروض و قوافی و زباندانی ممتاز اقران ..."

---

[1] مجمع النفائس ... [2] ریاض الشعراء ص ... [illegible]



عبدالحکیم حاکم لاہوری نے بھی فقیر دہلوی کو کئی بار دیکھا تھا۔ اس کا بیان اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ وہ ایک بلند کردار صوفی شاعر تھا۔ اور اپنے تذکرہ میں اس نے بیجا طور پر کسی کی تعریف نہیں کی ہے۔ لیکن فقیر دہلوی کی شاعری سے متعلق رطب اللسان تھا۔

"الحق درین وقت بی ہمتا ست و صاحب کمال"۔[1]

حاجی لطف علی بیگ آذر کو ہندوستانی شعرا سے کچھ تعصب تھا۔ اس لئے اس نے ہندوستانی شعراء کی تعریف بخل کے ساتھ کی ہے۔ علاوہ ازین اس کو ان شعراء سے بھی ہمدردی نہیں جو ایران کو ترک کرکے ہندوستان چلے آئے تھے لیکن فقیر دہلوی کی شاعری کی اس نے جو تعریف کی ہے۔ وہ قابل قدر ہے۔

"میر شمس الدین محمد فاضلی فقیر منش و شاعری نیکو روش"۔[2]

بھگوان داس ہندی کی ملاقات بھی فقیر سے ہوئی تھی۔ اس نے بھی فقیر کی شاعری کی بڑی تعریف کی ہے۔

"در اندک زمانے اخوبہ زمان و ناقد دوران شد۔ در فقہ و کلام و حدیث و تصوف خصوصاً در شعر و انشاء و عروض و قافیہ و معانی و بیان مہارت کلی داشت ..............

...... ہمہ کلامش نغز است و سراپا مغز"۔[3]

لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی کی ملاقات بھی فقیر دہلوی سے ہوئی تھی اس نے بھی فقیر دہلوی کی شاعری کی تعریف نہایت اچھے ڈھنگ سے کی ہے۔

---

[1] مردم دیدہ ص ۸۳ [2] آتش کدہ [3] سفینۂ ہندی مطبوعہ ص ۱۵۲۔

"عمدہ شعرائے حال است و سرآمد ارباب کمال در عہد ما نفیؔ" [1]

علی احمد خان ہاشمی سندیلوی نے فقیرؔ کی شاعری کی تعریف نہایت خلوص کے ساتھ کی ہے۔

"در فضل و کمال میر شمس الدین شکی نبودہ و ہم در اقران چون او درست و فصیح فارسی دانی نبودہ در علم شعر نیک ماہر ........ در انشأ و عروض و قافیہ و معانی و بیان و بدیع یکتائی روزگار بودہ" [2]

حسین قلی خان کے بیان سے بھی فقیرؔ دہلوی کی شاعری کی عظمت اور بلندی روشن ہے۔

"استعداد کثیرہ و سرمایۂ وافرہ بپیدا فصاحت و زباندانی و خوش لسانی بمرتبہ رسانیدہ کہ اہل عجم از دی حساب بر میداشت و وی را از گروہ فصحای انگاشتند" [3]

محمد قدرت اللہ نے فقیرؔ دہلوی کو ایک باکمال شاعر تسلیم کیا ہے ذیل میں اسکا بیان نقل کیا جاتا ہے۔

"گنجینۂ فنون دلپذیر ........ استعداد شائستہ...... در فنون نظم و نثر و معانی و بیان و بدیع و عروض و قوافی از منتخبین روزگار گردیدہ" [4]

رضا قلی خان ہدایت نے بھی فقیرؔ دہلوی کے علم و فضل اور شاعری کی تعریف کی ہے۔

"ظاہرا و باطنا طریق طریقت پذیرفتہ ملبس بہ لباس فقر

[1] گل رعنا [2] مخزن الغرائب [3] نشتر عشق [4] نتائج الافکار۔



شدہ سیاحت نمودہ و درجات عالیہ حاصل نمودہ" [1]

صدیق حسین خان فقیرؔ دہلوی کی شاعری کے بارے میں رقمطراز ہیں۔

"اما باعتبار سرمایۂ استعداد خداداد از اغنیاء زمان بود و در انشا و شعر و علم معانی و بیان و جز آن از فنون فضل و کمال و زباندانی فارسی ممتاز اقران خود زیست" [2]

# فقیرؔ غزل سرا

خان آرزوؔ [3] کا بیان ہے کہ فقیرؔ دہلوی نے زبان کی صفائی کو اس مقام پر پہنچایا کہ اہل زبان بھی اس پر رشک کرتے ہیں شاعری میں خصوصاً غزل گوئی میں اس کو کمال حاصل تھا۔ اس کی شاعری شاعرانہ محاسن سے آراستہ تھی۔ خان آرزوؔ نے مزید لکھا ہے کہ فقیرؔ نے فارسی شاعری کو ایک نہایت ممتاز مقام پر پہنچایا اور اس نے غزل گوئی میں بابا فغانی کا تتبع کیا ہے فقیرؔ دہلوی کو بابا فغانی سے بڑی عقیدت تھی اور فغانی کا انداز بیان اس کو بہت پسند تھا۔ اس نے دیوان فغانی سے اسی طرح استفادہ کیا جس طرح کوئی شاعر کسی زندہ استاد سے استفادہ کرتا ہے یہ حقیقت ہے کہ ہر شاعر کو کسی نہ کسی قدیم استاد کا طرز بیان پسند ہوتا ہے۔ اور وہ اسی روش کو اپناتا ہے۔ مثلاً علامہ اقبالؔ نے مولانا رومؔ کو اپنا پیر و مرشد تسلیم کیا ہے اور اسی روش پر چلا۔ ذیل میں علامہ اقبال کا شعر ملاحظہ ہو۔

[1] ریاض العارفین [2] شمع انجمن [3] مجمع النفائس

رومی پیر مرشد روشن ضمیر    کاروان عشق و مستی را امیر[1]

فقیر دہلوی کے دوست والہ داغستانی نے بھی فغانی کی روش کو اختیار کیا تھا۔ فغانی کے انداز بیان نے ایسی ہمہ گیر مقبولیت اختیار کی کہ فغانی کے نام سے ایک فغانی اسکول کا وجود ہوا اور فغانی کے بعد بہت سے شعراء اس روش پر چلے۔ ذیل میں خان آرزو کا بیان فقیر کی غزلوں کے متعلق نقل کیا جاتا ہے۔

"در غزل تتبع بابا فغانی دارد، بلکہ اگر انصاف فرمایند دانند کہ کمال ابروی ابیات بہ طاق بلند آویختہ ...... مشق سخن وصفائی زبان را بجای رسانیدہ کہ اہل زبان از حساب برمیدارند بلکہ بعضی دم از تلمذ شش می زنند ........ امروز مثل او در ہند نیست[2]"

اگر یہ کہا جائے کہ اس کی عاشق مزاجی نے اس کو ایک بڑا شاعر بنا دیا تو غلط نہ ہوگا۔ چونکہ اپنی زندگی کے اوائل میں عاشق مزاج تھا اس لئے اس کی غزلوں میں بڑا سوز اور درد پیدا ہوگیا ہے۔ اور اسی سوز اور درد نے ایسے عشق حقیقی کی طرف مائل کیا۔ ذیل میں اس کے چند عشقیہ اشعار نقل کئے جاتے ہیں جن سے سوز و درد کا اندازہ ہوتا ہے۔

برای نازنینی می کشم ناز جہانی را
بہوی یوسفی گیرم سرہ کاروانی را

دل ما تیرہ روزان پو ظالم بسملش کردی
درین تاریک شب کشتی چراغ دودمانی را

---

۱؎ مثنوی "پس چہ باید کرد"۔ ۲؎ مجمع النفائس



مگر آن مہ ز حال مہر ورزان باخبر گردد
دو چارشش کن خدایا ہم چون او نامہربانی را

بہ کس حال دل را گفتہ ام باور نمود اما[1]
نمی گردد یقین ہرگز نہ خاطر بدگمانی را

مولانا شبلی[2] نے لکھا ہے کہ تمام اہل فن اور ارباب تذکرہ کی رائے ہے کہ متوسطین کی شاعری میں ایک انقلاب پیدا ہوا جس کی وجہ سے ایک نیا دور وجود میں آیا۔ یہ دور متاخرین کے نام سے مشہور ہے اور بالفاظ دیگر دور نازک خیالی بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس دور کا بانی بابا فغانی تھا۔ فغانی کو تمام اہل سخن نے مجدد فن مانا ہے۔ ذیل میں والہ داغستانی کا بیان نقل کیا جاتا ہے۔ جس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے۔

"اکثر استادان زبان مثلاً مولانا وحشی یزدی، مولانا نظیری نیشاپوری، مولانا عرفی شیرازی، حکیم شفائی اصفہانی، حکیم مسیحا رکنای کاشی، مولانا ضمیری اصفہانی، و مولانا محتشم وغیرہم متتبع و مقلد و شاگرد و خوشہ چین خرمن طرز و روش او بودند[3]"

چونکہ فقیر دہلوی طرز و روش بابا فغانی کا دلدادہ تھا، اور اس نے اپنی شاعری کو اسی نہج پر ترقی دی اس لئے اس نے خود بھی اس بات کا اعتراف ذیل کے شعر میں کیا ہے۔ کہ اے فقیر تیری وجہ سے طرز فغانی پھر سے زندہ ہوئی اور اس طرح قدیم دوستوں کا نام پھر سے دنیا میں تازہ ہوگیا۔ ذیل میں وہ شعر نقل کیا جاتا ہے۔

تا گشت تازہ طرز فغانی ز من فقیر    یاران رفتہ را بہ جہان نام تازہ شد[4]

---

۱؎ دیوان فقیر ۲؎ شعر العجم ۳؎ ریاض الشعراء ۴؎ دیوان فقیر۔

بابا فغانی کی ذیل کی غزل مشہور ہے۔

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست
بسیار شیوہ ہاست بتان را کہ نام نیست[1]

فقیر دہلوی نے بھی اسی رنگ میں ایک غزل مسلسل کہی ہے۔ راقم حروف ذیل میں نقل کرتا ہے۔ قارئین کو یہ اندازہ ہوگا کہ فقیر کی ذیل کی غزل میں جو شیرینی، سوز، درد اور صفائی ہے وہ بابا فغانی سے کم نہیں ہے۔ بابا فغانی بابا فغانی تھا اور فقیر فقیر تھا۔ پھر بھی فقیر نے جس کامیابی کے ساتھ بابا فغانی کی روش کی پیروی کی ہے کم شعراء ہی اس کا مقابلہ کر سکیں گے۔ فقیر کی غزل ملاحظہ ہو

باقد یار لاف صنوبر تمام نیست
رعنا اگرچہ ہست ولی خوش خرام نیست

گیرم کہ لعل یار بود آب زندگی
اما چہ حاصل است چو ما را بکام نیست

دعوی جمال کند بار خش دلی
پیداست از کلف کہ بدعوی تمام نیست

جای کہ نقل از لب و چشم توی کند
مشتاق عشق را ہوس نقل و جام نیست

ما بیدلان بزور می ناب زندہ ایم
قالب تہی کنیم اگری بجام نیست

عشاق کی ز طعنہ زاہد ز جا روند
خاصیم و گوش ما بحدیث عوام نیست

حیرت ز بس بعالم یک رنگیم کشید
در روزگار ما اثر صبح و شام نیست

آہنگ نالہ دل ما را نکرد فہم
بیچارہ شیخ را خبری زین مقام نیست

بس بسینہ داغ بتان سوختم فقیر
در کورۂ دلم اثر از فکر خام نیست[2]

فقیر دہلوی کے اشعار میں سوز اور درد اپنے انتہائی کمال پر ہے اور اس

---

۱؎ دیوان بابا فغانی ۲؎ ... ستان (کلیات) ورق ۲۲

۳؎ دیوان فقیر خدا بخش لائبریری



وصف میں وہ ممتاز نظر آتا ہے۔ اس نے یہ انداز بیان فغانی سے سیکھا جیسا کہ ذیل کے شعر میں اسکا دعوی ہے۔

گستاخ دم ز طرز فغانی زنم فقیر
آتش پرست را ز دم آتشیں چہ باک

فقیر دہلوی نے بابا فغانی کی شاعری سے ایک خوشبو اڑائی تھی اور اسی خوشبو کو اپنی شاعری کے لباس میں ملا تھا۔ فقیر دہلوی کو اس کا احساس تھا کہ اگر بابا فغانی اس خوشبو کو سونگھ لیتے تو یہی کہتے کہ ایسی خوشبو تو پیراہن یوسف[4] میں بھی نہ تھی۔ فقیر کا شعر ذیل میں ملاحظہ ہو۔

شعر مرا فقیر فغانی شنید و گفت
یوسف نداشت نکہت پیراہن این چنین

آخر فقیر دہلوی کی غزلوں میں سوز اور درد کیوں نہ ہو کیونکہ اس نے بابا فغانی کی روش اختیار کی تھی۔ اور اس روش میں وہ بہت حد تک کامیاب نظر آتا ہے۔ اس نے نہایت فخر کے ساتھ بابا فغانی کو غزل گوئی میں اپنا استاد تسلیم کیا ہے۔ ذیل کے شعر سے یہ بات واضح ہوتی ہے۔

استاد ما فقیر فغانی ست در غزل
رسمی چنان گذاشت کہ نتوان ازان گذشت[5]

فقیر دہلوی کے ذیل کے شعر سے بھی بابا فغانی سے عقیدت کا اظہار ہوتا ہے

آشنا روزی کہ با طرز فغانی شد فقیر
نقش می بستم کز آخر نکتہ دانی می شود

نظیری نیشاپوری دور اکبری کا نامور شاعر تھا لیکن جہانگیر نے بھی

---

۴؎ ۵؎ دیوان فقیر خدا بخش لائبریری

اس کو عنایتوں سے نوازا تھا۔ مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ نظیری ایک مذہبی
آدمی تھا اور اپنی زندگی کے آخری حصہ میں اس نے گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی۔
حج کے فریضہ سے بھی بہرہ ور ہوا تھا۔ فقیر دہلوی کو نظیری کی شاعری اور طرز روش
بیحد پسند تھی۔ اس لیئے اس نے اس روش پر چلنے کی سعی کی اور اس میدان
میں بہت آگے بڑھ گیا۔ لیکن جو شہرت نظیری کے لیئے مخصوص ہے وہ فقیر دہلوی
کو کیسے مل سکتی تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فقیر دہلوی نے نظیری کی روش کو
صرف اپنایا ہی نہیں۔ بلکہ اس کو سینہ سے لگایا اور اس راہ میں بہت دور تک
نکل گیا۔ لیکن نظیری کے مقام تک نہ پہنچ سکا۔ فقیر نے خود اس بات کا اظہار
اپنے ذیل کے شعر میں کیا ہے۔

با نظیری نمی کند دعوی ہم چشمی فقیر
کم دو چارم شد کہ چشمی تا بدامن بر نداشت

فقیر نظیری کے کلام کا والہ و شیدا تھا۔ جیساکہ اس کے ذیل کے شعر سے
واضح ہوتا ہے۔

از خود ربود حسرت نظیری مرا فقیر
فرصت نہ شد کہ از تو کنم جستجوی خویش

فقیر کے ذیل کے شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے نظیری کی روش کو صرف
اختیار ہی نہیں کیا بلکہ اسے ایک نئے رنگ میں پیش کیا اور اگر یہ تصور کیا
جائے کہ اس نے نظیری کی شراب کو پینے کے لیئے اپنے ہاتھوں میں لیا لیکن پینے
سے قبل اس نے اس میں خون عشق ملا دیا۔ یعنی ایک تو نظیری کے پیالہ میں عشق
تھا لیکن فقیر نے اس پیالہ میں عشق کا تازہ لہو ڈالدیا تاکہ اور بھی دیوانگی پیدا ہو
جائے شعر مرقوم ہے۔

رنگ دگر بخشیدہ ام طرز نظیری را فقیر
ساقی بدستم داد می پیمانہ پر خون کردمش



فقیر دہلوی کو بلا شبہ الفاظ پر قدرت حاصل تھی۔ اس کی غزلوں میں موزوں
الفاظ نظر آتے ہیں۔ مصرعوں پر بہت غور کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ فقیر نے
جس مصرع میں جس لفظ کو استعمال کیا ہے اگر اس کو ہٹا دیا جائے تو وہ مصرع
بے رنگ ہو کر رہ جائے گا۔

فقیر کی غزلیں وجدان سے لبریز ہیں۔ لطف یہ کہ حسن ادا میں ماہر تھا
شاعری کی اعلیٰ تعلیم نے اس کو بلند مقام پر پہنچا دیا تھا۔ مولانا شبلی نے لکھا
ہے کہ جس شاعر کی قوت تخیل جس قدر تیز ہوگی۔ وہ شاعر اتنا ہی بہتر شعر
کہے گا۔ بلا شبہ تخیلات کی دنیا میں فقیر دہلوی ایک بلند مقام رکھتا ہے جسکا
ثبوت اس کے دیوان کے مطالعہ سے ملتا ہے۔ مثلاً ذیل کے شعر میں اس نے
اس بات کا اظہار کیا ہے۔ کہ جس شخص کے دل میں عشق نہیں ہے اس شخص کے
لیے معشوق کے حسن کے بارے میں سوچنا بے فائدہ ہے۔ اور جو پرندہ نہیں ہے
اس کو گل بہار سے کیا فائدہ ہے۔ حسن تو اس کے لیے ہے۔ جس کے دل میں
عشق ہو کیونکہ عاشق ہی حسن کی قدر کر سکتا ہے جسطرح پرندے بہار کے پھولوں
کی قدر کرتے ہیں۔ انداز بیان دلکش ہے۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں تو
فقیر کی قوت تخیل کا نمونہ ہیں۔

ترا کہ عشق نداری ز حسن یار چہ حظ
چو عندلیب نۂ از گل بہار چہ حظ

ترا کہ دل نہ سپردی بہ نیش مژگانی
زکاوکاو چہ لذت ز خار خار چہ حظ

فقیر دہلوی نے نظیری کی طرح عام طور پر عشق و عاشقی کی
سچی اور صحیح وارداتیں بیان کی ہیں جن سے دلوں پر خاص اثر پڑتا
ہے۔ ذیل میں دو شعر نقل ہیں۔

زمن امروز نام عاشقان زندہ ست در عالم
بگوہ درد فرہاد و بدشت عشق مجنونم

فقیر آہن شود موم از دم گرمی کہ من دارم
ولیکن در دل جانان نگیرد ہیچ افسونم

نظیری کا ذیل کا شعر مشہور ہے

گرچہ میدانم قسم خوردن بجانت خوب نیست
ہم بجان تو کہ یادم نیست سوگند دگر

مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ اس شعر میں بڑی شوخی پائی جاتی ہے نظیری کہتا ہے کہ محبوب کی جان کی قسم کھانا اچھی بات نہیں لیکن اس کی جان ہی کی قسم نظیری کو یاد ہے۔ اور کوئی قسم یاد نہیں۔ بلاغت اور شوخی یہ ہے کہ قسم کھانا نہیں چاہتا پھر بھی کھائے جاتا ہے۔ اور فقیر دہلوی نے بھی اس رنگ میں ایک غزل کہی ہے جس کے چند اشعار قارئین کے لئے قلم بند کیے جاتے ہیں

ای ہر طرف ز دست تو پا در گلی دگر
ہر سو طپان ز تیغ غمت بسملی دگر

کہ زیستن بفراق تو مشکل ست
آسان نمود پیش تو این مشکلی دگر

مجنون خیال کرد کہ لیلی بہ محمل است
غافل کہ داشت لیلی او محملی دگر

داریم نیم جان دبراہی کہ می رویم
در ہر قدم دو چار شود قاتلی دگر[1]

---

[1] دیوان فقیر خدا بخش لائبریری



فقیر دہلوی نے نظیری کی طرح اپنی بہت سی غزلوں میں کسی خاص حالت کو مسلسل لکھا ہے اور پوری غزل ایک ہی حالت میں بیان ہو گئی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی مضمون کی تمام جزئیات سے اچھی طرح واقف تھا۔ اور تسلسل بیان کو بڑی خوبی سے قائم رکھا ہے ذیل میں اس کی ایک مسلسل غزل سے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

راحت خیال می کنم آزار خویش را | دارم از آن عزیز دل آزار خویش را
گویند کارسازی عاشق کند وصال | من در فراق ساختہ ام کار خویش را
خوبان کی عزیز جہانی بیک نگاہ | کی می کشند ناز خریدار خویش را
قید تو خوشتر از آزادی دو کون | عالم رہا ساز گرفتار خویش را

فقیر دہلوی کو والہ داغستانی سے بڑی محبت تھی اور وہ اس کی بڑی عزت کرتا تھا۔ اس نے والہ کی ایک غزل کے جواب میں ایک غزل کہی اور بہت خوب کہی۔ ذیل میں پہلے والہ داغستانی کی غزل کے دو شعر نقل کیے جاتے ہیں۔

در سینہ کاوش نگاہش ہماں کہ ہست
مارا ولی نماندہ داد را گماں کہ ہست

یارب چہ کردہ ام کہ آن سنگ دل بما
ہرگز نبودہ این ہمہ نامہربان کہ ہست[1]

اب ذیل میں فقیر دہلوی کی ایک غزل کے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں جو والہ داغستانی کی مندرجہ بالا غزل کے جواب میں ہیں۔

اخلاص ما یقین شد او ما چناں کہ ہست
جان دادہ ایم یار ہما بدگمان کہ ہست

---

[1] دیوان والہ داغستانی نسخہ لندن ورق ۳۴ ب

گفتی دلا کہ دلبر ما ظلم پیشہ نیست
ایمن مباش از آن بت نامہربان کہ ہست

یکبارہ ہم نسوخت دل او بحال من
مجنون گداخت از غم لیلیٰ ہمان کہ ہست

از کف رباد مصرع والہ دل فقیر
ما را دلی نماندہ داد دلا گمان کہ ہست

فقیر دہلوی نے ایک غزل عرفی شیرازی کی ایک غزل کے جواب میں بھی کہی۔ عرفی کی غزل کا ایک مصرع ملاحظہ ہو ع

گنجی نمی گرفتہ فقیرانہ سوختیم

فقیر دہلوی کی اس غزل کا دو شعر ذیل میں نقل کیا جاتا ہے جسے اس نے عرفی کی مذکورہ بالا غزل کے جواب میں قلمبند کیا ہے۔

دل را ز برق جلوۂ جانانہ سوختیم
ما بلبلان ز آتش گل خانہ سوختیم

حال مرا بپرس ز عرفی کہ گفتہ است
گنجی نمی گرفتہ فقیرانہ سوختیم

فقیر دہلوی ایک صوفی اور عارف بھی تھا۔ وہ عشق حقیقی اور معرفت کے رموز سے اچھی طرح باخبر تھا۔ اس کے اشعار سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے

نہان در بندگی کار خدائے ست | بچشم عاشقان صد آستان است
نشان دلبر خود از کہ پرسم | کہ با چندین نشانہا بی نشان است

فقیر دہلوی کو زندگی ہی میں وہ شہرت اور مقام مل گیا تھا جو کم لوگوں کو ملتا ہے۔ اس کے ہمعصر تذکرہ نگار خان آرزو، والہ داغستانی اور لچھمی نرائن شفیق سبھی نے اس کی شاعری کی تعریف کی ہے۔ فقیر کو بھی اس بات کا



احساس تھا کہ وہ ایک بلند درجہ صوفی شاعر ہے۔

لذت قند مکرری دہد شعر فقیر

مولانا شبلیؒ نے لکھا ہے کہ اچھا شعر وہ ہے جو جذبات انسانی کو برانگیختہ کرے اور ان کو تحریک میں لائے[1]۔ فقیر دہلوی کی شاعری کا گہرا مطالعہ کرنے سے یہ بات روشن ہوتی ہے کہ اس کے اشعار میں جذبات انسانی برانگیختہ کرنے کی پوری صلاحیت ہے۔ اور قاری کے دل و دماغ میں ایک جنبش ہی نہیں بلکہ طوفان پیدا ہوتا ہے۔ ذیل میں اس کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

ہمچو شاخ گل جنون آمادہ ام | انتظار نو بہاری می کشم
چون نمی آید نگارم در کنار | بعد ازین خود را کناری می کشم

فقیر دہلوی کی غزلیں پختہ، پر مغز اور پر کشش ہیں۔ اسکے دیوان میں اچھے اشعار کی کمی نہیں ہے۔ بلکہ پورا دیوان ایک انتخاب معلوم ہوتا ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

تا دامن تو در کف اغیار دیدہ ایم | از رشک رفتہ ایم و گریبان دریدہ ایم
دانی کہ چیست داغ جنون بر سر فقیر | جام محبت است کہ بر سر کشیدہ ایم

اس کی غزلوں میں شیرینی اور حلاوت پائی جاتی ہے۔ اس وصف میں خواجہ حافظ اور شیخ سعدی باکمال تھے۔ لیکن فقیر دہلوی کو بھی قدرت نے یہ خوبی بخشی تھی۔ ذیل میں دو اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔ گرچہ اس کا ہر شعر شیرینی اور مٹھاس سے پر ہے۔

ہمچو چشم یار مستم ملّی | روز و شب ساغر پرستم ملّی
یاد آن لب می برم با خود بخاک | تا قیامت می پرستم ملّی

---

[1] شعر العجم جلد چہارم

مولانا شبلیؔ نے لکھا ہے کہ خواجہ حافظؔ کے کلام میں جو جذبات ہیں وہ خود ان کے اپنے جذبات اور حالات ہیں اور اس نے ان کو اس جوش کے ساتھ ادا کیا ہے کہ پڑھنے والے پر ایک عالم چھا جاتا ہے۔ بلاشبہ فقیرؔ دہلوی بھی اسی خوبی میں خواجہ حافظؔ کا پیرو ہے۔ اس کے اشعار بھی اس کے اپنے جذبات اور حالات کی ترجمانی کرتے ہیں اور قاری پر ایک محویت پیدا ہو جاتی ہے ذیل میں اسکی ایک غزل نقل کیجاتی ہے۔

ای از تو بی آرام جان آرام جان کیستی
بردہ ز من تاب و توان تاب و توان کیستی

بر گل بنفشہ ریختہ بر لالہ عنبر بیختہ
سنبل ز سرو آویختہ باغ جہان کیستی

سوزم فزاید ساز تو دل می رباید ناز تو
شوخم برو اندر تو سرو روان کیستی

از غمزہ دلہا دوختہ وز چہرہ جانہا سوختہ
ای آتش افروختہ از دودمان کیستی

از عاشقان تو شدم یکی خانمان تو شدم
من خود از آن تو شدم تا تو از آن کیستی

کشتی مرا از تیغ کین ما یدہ بار آستین
اکنون بگوی نازنین در امتحان کیستی

خلقی بہ یک سو بستہ صف قاطع زاہد و تلف
با نقد جان نای بکف جنس دکان کیستی

تا کشتہ زلفت بادہ کاسہ شد و باز از سمہ
آوردہ سروت بار سماز بوستان کیستی

کلکت فقیرؔ اندر بنان شد طوطی شکر فشان
ایکنخنی سحر از بیان ہم داستان کیستی

پرانے اور فرسودہ مضامین کو بھی فقیرؔ دہلوی نے جدت ادا کی وجہ سے دلکش بنا دیا ہے۔ اور بڑی خوبی یہ ہے کہ پڑھنے والا مطلب کو بآسانی سمجھ جاتا ہے اس کے اشعار میں پیچیدگی بالکل نہیں ہے بلکہ فغانیؔ، شیخ سعدیؔ، حافظؔ اور مولانا جامیؔ کی طرح بالکل سادہ ہیں۔ لیکن شعر پر جتنا زیادہ غور کیا جاتا ہے اتنا ہی زیادہ

سلہ شعرالعجم جلد دوم



بامعنی اور پرکشش بنجاتا ہے فقیرؔ دہلوی کے اشعار عرفیؔ یا نظامیؔ کی طرح محتاج شرح نہیں۔ عہد اکبری اور جہانگیری میں ہندوستان میں فارسی شاعری میں نہایت پیچیدگی اور دقت آفرینی پیدا ہو گئی تھی۔ عرفیؔ شیرازی نے اس پیچیدگی کو بام عروج پر پہنچا دیا تھا۔ لیکن عرفیؔ شیرازی کے تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد ہندی شعراء پھر سے زبان کی صفائی اور سادگی کی طرف پلٹے اور فقیرؔ دہلوی نے مخصوصاً اس سادگی کو درجۂ کمال پر پہنچایا۔ فقیرؔ دہلوی سے قبل بیدلؔ نے بھی زبان کو پیچیدہ بنا دیا تھا فقیرؔ دہلوی کی زبان میں جو صفائی اور سادگی تھی اسکا مقابلہ ہم شیخ سعدیؔ اور مولانا جامیؔ کے اشعار سے کر سکتے ہیں۔ ذیل میں کچھ اشعار بطور نمونہ نقل کیے جاتے ہیں۔

ناتوان کرد مرا چشم خوش یار چنین
ورنہ زین پیش نبودم من بیمار چنین

صورت حال من از حیرت آئینہ مپرس
تا دو چار شدم رفتہ ام از کار چنین

گر بگویت نرسد آہ سحرگاہی من
کہ کند درد دلم را بتو اظہار چنین

مرگ از قید سر زلف تو آزاد نکرد
ہیچ کافر نشود بستۂ زنار چنین

فقیرؔ دہلوی کے اشعار میں فلسفہ بہت کم ہے وہ ایک صوفی اور سادہ مزاج شاعر تھا اگرچہ اسکے اشعار میں رنگینی پائی جاتی ہے لیکن اس کے ایسے اشعار اسکی اوائل زندگی کے ہیں۔ رباس فقر اختیار کرنیکے بعد اس نے اس رنگ کو ترک کیا۔ ذیل میں اس کے چند رنگین اشعار درج کیے جاتے ہیں۔

تا رفتہ از کنار من
سخت تیرہ است روزگار من

ہمچو عندلیب نالہ گر کنم
نشنود یکی از ہزار من

روزگار وصل رفت ہمچو گل
یادگار اوست خار خار من

بسکہ خون دل می خورم مدام
لالہ سر زند از مزار من

مولانا شبلیؔ نے لکھا ہے کہ شاعری (اچھا شعر) تمام حواس پر اثر ڈالتی ہے

لے شعرالعجم جلد چہارم

بلاشبہ فقیر دہلوی کی شاعری میں یہ تاثیر پائی جاتی ہے کہ پڑھنے والے اثر لئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ نظامی عروضی[1] کا بیان ہے کہ اچھا شعر وہ ہے جو اس کے کہنے والے کے بعد بھی زندہ رہے۔ جس شعر میں اپنے آپ کو زندہ رکھنے کی صلاحیت نہیں ہے وہ اس شاعر کو کیسے زندہ رکھ سکتا ہے جس نے اس شعر کو کہا۔ فقیر دہلوی کے اشعار کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ ایک باکمال شاعر تھا اور اس کو زندہ رہنا ہے۔ جب تک فارسی ادب اور شاعری زندہ رہے گی وہ گمنام اسلئے ہیں کہ عوام اس کی شاعری سے بیخبر ہیں کیونکہ آج تک اس کا دیوان یا اس کے اشعار شائع نہیں ہوئے۔ شاعری اندرونی جذبات اور احساسات کی تصویر ہوتی ہے۔ اس لئے شاعر کو جذبات سے بھرپور ہونا چاہئے اسکا دل حساس اور نازک ہو تاکہ اپنے احساسات کو شعر کا لباس پہنا سکے فقیر دہلوی کو قدرت نے ایک نہایت حساس اور زندہ دل دیا تھا۔ ایک ایسا دل جو طمع دنیا سے پاک تھا۔ اور جس کے اندر صرف خدمت خلق کا جذبہ تھا۔ اسکے اشعار میں زندگی اور تڑپ ہے جو خود زندہ ہے اور قارئین کے مردہ دلوں میں بھی تازگی بھر دیتا ہے۔ کیونکہ فغانی اور نظیری کی روح اس کی شاعری میں پنہاں ہے اور اس نے ان دونوں باکمال استادوں کی پیروی کی ہے شاعری کے لئے قوت تخیل بہت لازمی شئے ہے۔ جس شاعر کی قوت تخیل جتنی قوی اور پختہ ہوگی وہ اتنا ہی بلند شعر کہہ سکے گا۔ اس لئے جس شاعر کو یہ دولت قدرت کی طرف سے زیادہ ملتی ہے وہ اتنا ہی زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔ رودکی فردوسی، منوچہری، سعدی، حافظ اور قاآنی جیسے نامور اور باکمال فارسی شعراء قوت تخیل کی دولت سے مالا مال تھے۔ قدرت نے فقیر دہلوی کو بھی

[1] چہار مقالہ



قوت تخیل سے نوازا تھا، اس لئے وہ شعراء کی صف میں ایک ممتاز مقام پر نظر آتا ہے۔ اس کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں جن سے اس کی قوت تخیل کا اندازہ ہوتا ہے

تافتاد از زلف او عکسی در آب — آشنای سرمہ شد چشم حباب
من نہ از خودی روم دنبال او — سایہ را سرگشتہ دارد آفتاب
مال دنیا کم نہ سازد حرص را — کس نہ شد سیراب از موج سراب
تاب دیدن نیست ورنہ یار من — ہمچو خورشید است دائم بی نقاب

رودکی نے فارسی شاعری کو جو سلاست اور صفائی بخشی تھی آج تک کتابوں میں درج ہے ظہیر فاریابی نے فارسی قصیدوں کو سلاست اور صفائی بخشی تھی۔ حافظ اور شیخ سعدی کے کلام میں بھی سلاست اور صفائی درجۂ کمال پر ہے لیکن فقیر دہلوی بھی اس وصف میں ایک مقام رکھتا ہے اس کے اشعار اس کی سلاست اور صفائی پر شاہد ہیں ذیل میں صرف چار اشعار نقل کئے جاتے ہیں

دل را ز برق جلوۂ جانانہ سوختیم — ما بلبلان ز آتش گل خانہ سوختیم
بستیم دل بزلف ستم پیشہ کافری — یاران چراغ کعبہ بہ بتخانہ سوختیم
عاشق نواز نیست بت شعلہ خوی ما — در انجمن ز حسرت پروانہ سوختیم
اسلام ماند یک طرف و کفر یک طرف — ما در میان کعبہ و بتخانہ سوختیم

مولانا شبلی[1] کا بیان ہے کہ شاعری کے لئے جدت ولطف ادا سب سے مقدم شئے ہے بلکہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جدت ادا ہی کا نام شاعری ہے مثلاً ایک بات کو سیدھی طرح سے کہا جائے تو یہ ایک معمولی بات ہے لیکن

[1] شعر العجم۔ جلد چہارم

اگر اسی بات کو جدید انداز اور نئے اسلوب سے باندھا جائے تو یہ کمال ہے فقیر دہلوی بھی اس وصف میں ماہر تھا۔ چونکہ اس کی تعلیم اس زمانہ کے باکمال استادوں سے ہوئی تھی اس لئے وہ ان باتوں سے آشنا تھا۔

شیخ سعدی نے معشوق کے بارے میں کہا تھا۔

دوستان منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم　　باید اول بتو گفتن کہ چنین خوب چرائی

فقیر دہلوی نے اس خیال کو نئے ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔

گیرم کہ لعل یار بود آب زندگی　　اما چہ حاصل است چو ما را بکام نیست

ما بیدلان بزدری ناب زندہ ایم　　قالب تہی کنیم اگر می بجام نیست

فقیر کے دیوان میں اخلاقی اشعار بھی ملتے ہیں۔ اخلاقی شاعری اخلاق کو درست کرتی ہے اخلاقی تعلیم کے لئے ایک شعر ایک ضخیم کتاب سے بھی بڑھ کر ہے۔ کیونکہ شعر دلوں پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ مثلاً شیخ سعدی کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

نگردد تہی کیسہ پیشہ ور　　بگردد تہی کیسۂ سیم و زر

فقیر دہلوی کے چند اشعار اخلاقی تعلیم سے متعلق درج کئے جاتے ہیں۔

صد نقد عیش در گرہ غم نہفتہ است　　خرم کسی کہ با دل غمناک شاد رفت

بی مطلب است مطلب عارف درین جہان　　عین مراد گشت اگر نامراد گشت

دنیا نکرد ہمرہی اہل فقیر خود　　تاج و نگین بجاست دلی کیقباد رفت

فقیر دہلوی کے اشعار میں فصاحت اور بلاغت بھی درجہ کمال تک ہے رودکی، شیخ سعدی اور خواجہ حافظ فصاحت اور بلاغت میں بے مثال تھے۔ لیکن فقیر دہلوی کو بھی قدرت نے یہ صفت دی تھی اس کے اشعار شاہد ہیں۔

حسن را با ہر دلی باشد سر و کاری جدا



ہر طرف گرم است ازین خورشید بازاری جدا

شور محشر می رسد در گوش ازان زنجیر زلف

بسکہ در ہر حلقہ می نالد گرفتاری جدا

فقیر دہلوی کے کلام میں استعارات اور تشبیہیں پیچیدہ نہیں ہیں اس نے جو استعارے اور تشبیہیں استعمال کی ہیں۔ وہ سعدی جامی، اور حافظ کی طرح آسان ہیں۔ اس لیے قاری کو کوئی دقت اشعار کے سمجھنے میں پیدا نہیں ہوتی ہے چند اشعار ذیل میں مرقوم ہیں۔

بسکہ شد لبریز حسرتہا دل پر درد ما　　چشم خورشید تیغ بند د ز آہ سرد ما

سیمرغ را چگونہ کند صید عنکبوت　　طول امل نگشت کمند شکار عمر

فقیر دہلوی نے قدماء کی روشن کو اختیار کیا تھا۔ اور چونکہ اعلیٰ تعلیم سے آراستہ تھا اس کو فارسی شاعری میں کمال حاصل کرنے میں دیر نہیں لگی جو شخص علم عروض اور علم بیان میں صاحب تصنیف ہو ظاہر ہے اس کے اشعار فن شاعری سے آراستہ ہونگے

خبر از شور جنون من نا کامش نیست

نمکی از لب لعلی نچشیداست ہنوز

کی فقیر از دل صد پارہ ام آگاہ شود

ناز نینی کہ گریبان ندریداست ہنوز

فقیر دہلوی کے کلام میں جوش بیان بھی ایک بلند مقام پر نظر آتا ہے۔ عشق مجازی اور پھر عشق حقیقی نے اس کے دل و دماغ کو عشق کے شعلوں سے بھر دیا تھا۔ وہ سراپا عشق و عرفان تھا۔ اس کے سارے اشعار جوش سے لبریز ہیں۔ اس وصف میں وہ خواجہ حافظ کا پیرو ہے فغانی سے اس کو بڑی عقیدت تھی اس لئے اس کے کلام میں جوش

کی فراوانی ہے ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

بالحسرت دل بدیدہ گریاں فروختیم　　ایں کشتی شکستہ بطوفان فروختیم
فالے شدہ ازاں لب شیریں بحرف تلخ　　امید را بقیمت حرماں فروختیم
دیدیم امتیاز زلیخا و شے نبود　　یوسف بہ پیش مفلس کنعان فروختیم
از سود ما مپرس بسودای عاشقی　　ایمان بکفر زلف پریشان فروختیم

فقیر دہلوی نے اپنے اشعار میں شاعری کے اصولوں کی اچھی طرح پیروی کی ہے۔ مولانا روم کی طرح اس کے اشعار میں شاعرانہ نقائص نہیں ملتے چونکہ مولانا روم تعلیم شاعری سے بے بہرہ تھے اس لئے ان کے کلام میں اکثر مکررات ملتے ہیں۔ وہ پہلے ایک باکمال صوفی تھے اور بعد میں شاعر تھے شاعری کو انہوں نے محض تبلیغ دین کے لئے استعمال کیا۔ ان کی شاعری میں اس لئے شاعرانہ نقائص ملتے ہیں۔ فقیر دہلوی کے دیوان اور کلیات میں ہزاروں ایسے اشعار ہیں جو عشق سے بھرپور ہیں۔ اس کی شاعری کا ایک حصہ عشقیہ ہے جس کا تعلق اس کی زندگی کے پہلے حصہ سے ہے۔ (ترک دنیا سے قبل جبکہ اس کی عمر ۴۰ سال تھی) مولانا شبلی[1] کا بیان ہے کہ عشق ایک فطری کشش ہے جو ہر جاندار میں پائی جاتی ہے۔ عشق پہلے دل میں پیدا ہوتا ہے اس کے بعد ایک خاص ذوق و شوق اور شورش پیدا کرتا ہے ہر جاندار کے دل میں ایک بے چینی اور تڑپ پیدا ہو جاتی ہے عشق کی منزل پرخطر اور طویل ہوتی ہے بلکہ بعض اوقات ساری عمر لگا دینے کے باوجود بھی یہ راہ طے نہیں ہوتی۔ ایک عاشق سیکڑوں نئی نئی وارداتوں اور مقامات سے گزرتا ہے کبھی ہجر کی بے قراری تو کبھی وصل کی منزل عاشق کو ان سارے مراحل سے

[1] شعر العجم جلد پنجم۔



دوچار ہونا پڑتا ہے اور کوئی حالت مزہ اور لطف سے خالی نہیں ہوتی عشق کبھی انسان کو بزدل بناتا ہے اور کبھی بہادر۔ اس راہ میں ایک ایسا مقام بھی آتا ہے کہ ایک عاشق مال و دولت کے باوجود خود کو فقیر اور گدا بنا دیتا ہے۔ دنیا کی بعض بڑی شخصیتیں بھی اس مرض سے نہ بچ سکیں۔ مولانا شبلی[1] نے مزید لکھا ہے کہ انسان پر ہی موقوف نہیں بلکہ کائنات کی ہر شے میں عشق کا جذبہ پایا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ فقیر دہلوی بھی عشق سے نہ بچ سکا اس لئے اس کے دیوان کا ایک بڑا حصہ عاشقانہ اشعار سے بھرا ہوا ہے۔ مثلاً مولانا شبلی کی رائے ہے کہ عشقیہ شاعری سے روح کو تازگی ملتی ہے۔ اور زندہ دلی پیدا ہوتی ہے۔ ذیل میں فقیر دہلوی کی صرف ایک غزل نقل کی جاتی ہے۔ جو عشق سے لبریز ہے۔

تا بآن مہ جبین دوچار شدیم　　چو دل دوست خود زکار شدیم
در کباب جگر نمک زد عشق　　تشنۂ لعل [illegible] دار شدیم
نو بہار جنون ما گل کرد　　ہم چو بلبل بیکے ہزار شدیم
یار ما از کنارہ می جوید　　تا سراپا ہمہ کنار شدیم
عشق ما را نہال کرد آخر　　آہ گشتیم و شعلہ بار شدیم
وعدہ ات صبر و طاقت ما برد　　از قرار تو بی قرار شدیم
ایں ثمر داد نخل مہر و وفا　　بر دل نازک تو بار شدیم
تا برآوری بجلوہ گرد از ما　　بہوای تو خاکسار شدیم
خون ما گرد چون حنا پامال　　ہمہ تن وقف آن نگار شدیم
نیم جانی فدائی او کردم　　سخت شرمندۂ نثار شدیم

[1] شعر العجم جلد چہارم۔

از امید وصال یار فقیر
تو شدی باغ دما بہار شدیم

فقیر دہلوی کے تعلقات نظام الملک آصف جاہ اور دیگر امرار وقت سے نہایت استوار تھے اگر وہ چاہتا تو دولت کا انبار لگا دیتا۔ لیکن بھلا مرد فقیر کو دولت سے کیا واسطہ اس لئے اس نے کبھی دولت حاصل کرنے کی کوشش نہ کی بلکہ اپنے آپ کو گوشۂ انزوا میں لباس فقیر میں رکھا ورنہ سیم وزر سے مالا مال ہوتا۔ مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ فارسی شاعری اسوقت تک ایک بیجان قالب تھی جب تک کہ تصوف کا عنصر شامل نہیں ہوا تھا شاعری اصل میں جذبات کے اظہار کا نام ہے۔ اور تصوف سے قبل جذبات کا وجود نہ تھا۔ قصائد میں ممدوح کی بیجا تعریف اور خوشامد ہوتی تھی۔ مثنوی کی صنعت واقعہ نگاری کے لئے مخصوص تھی۔ اور غزل عشقیہ جذبات سے لبریز تھی۔ مگر تصوف کی دولت عشق حقیقی ہے اور یہ حقیقی عشق جوش اور جذبہ سے سرشار ہوتا ہے۔ مولانا شبلی کا بیان ہے کہ صوفیانہ افکار کو سب سے پہلے شیخ ابو سعید ابوالخیر نے اپنی رباعیوں میں ادا کیا تھا لیکن ایران میں جدید تحقیق نے یہ بتایا ہے کہ شیخ ابو سعید ابوالخیر نے رباعی نہیں کہی تھی۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ دیگر شعراء کی رباعیوں کو کسی دوسرے شعراء کے نام سے شہرت دیدی گئی ہے۔ لیکن راقم حروف کا خیال ہے کہ شیخ ابو سعید ابوالخیر نے کچھ ضرور کہی ہیں۔ اور وہی رباعیاں فارسی کی صوفیانہ شاعری کا سنگ بنیاد ہیں۔ ان کے بعد حکیم سنائی، اوحدالدین کرمانی، خواجہ فریدالدین عطار اور مولانا روم نے اپنے افکار سے فارسی کی صوفیانہ شاعری کو گران بہا بنا دیا۔ فقیر دہلوی نے بھی عشق مجازی میں ناکام ہونے کے بعد لباس فقر ۲۹ سال ہی کی عمر میں پہن لیا اور اس کے سینہ سے جو شعلے اور آہیں نکلیں اس نے



اس کی صوفیانہ شاعری کو تابناک بنا دیا۔ بلاشبہ وہ اپنے عہد کا ایک ممتاز صوفی شاعر تھا۔ اسکے ہمعصر تذکرہ نگاروں نے اس کی صوفیانہ شاعری کی تعریف کی ہے۔ ایران کے تذکرہ نگار رضا قلی خان ہدایت کا بیان نقل کیا جاتا ہے۔

"در خدمت علمای صاحب مایہ وبلند پایہ وجود فضائل طالب خدمت درویشان وغالب اوقات در صحبت ایشان آخر الامر از برکت معاشرت ایشان بترک علائق وعوائق دنیوی گفتہ و ظاہراً وباطناً طریق طریقت پذیرفتہ ملبس بہ لباس فقر شدہ [1]"

ذیل میں فقیر دہلوی کے چند صوفیانہ اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

نیست ممکن کہ بیک شہر دو سلطان باشد
در دل ہر کہ غم اوست غم عالم نیست

یار در چشم و دیدنش مشکل — راہ نزدیک و طی شدن دشوار

در نبرد عشق کی تاب آورد اہل ہوس
پا درین میدان فشرد آن کس کہ فکر سر نداشت

آفتاب داغ عشق از شرق جانم می دمد
اندران روزی کہ این ہفت آسمان انجم نداشت

فقیر دہلوی کو زبان عربی سے بھی اچھی طرح واقفیت تھی کیونکہ ایک غزل میں اس نے ہر دوسرا مصرع عربی میں باندھا ہے۔ ذیل میں وہ غزل پیش ہے۔

در جہان دیگر ندارم غم ز آسیب ہلاک — حیثما افنیتنی ابقیتنی روحی فداک

[1] ریاض العارفین ص ۱۸۹ چاپ ایران۔

مطلبم از سیر دنیا جلوۂ دیدار تست    لو تری عینی الیہا لیس منظوری سواک
دل بزور از پہلویم می بر دپیکان ترا    قلت دع ہذا متاع لی ذالک بالاشتراک
تا ترا دیدم شدم از ہستی بی نیاز    ذات قلبی فی بقا ملک غاب فقری فی غناک

بر سر راہی فقیر آن شوخ با من شد دوچار
قال لا ینظر الینا قلت لا انظر سواک

شاعری موزوں اور دلکش الفاظ کو ایک دھاگے میں پرونے کا نام ہے جس میں قافیہ اور ردیف کی شرط ہے۔ بلاشبہ فقیر دہلوی کی شاعری موزون الفاظ سے آراستہ ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسکو الفاظ پر قدرت حاصل تھی۔ اسکا پورا دیوان شاہد ہے۔

فقیر دہلوی نے خواجہ حافظ کے رنگ میں بھی غزل کہی ہے ذیل میں فقیر دہلوی کی ایک غزل نقل کی جاتی ہے۔ جو حافظ شیرازی کی ایک مشہور غزل کے جواب میں ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

چو گل ہر دم بہ بویت جامہ در تن    کنم چاک از گریبان تا بدامن[1]

اسی بحر و وزن میں فقیر کی غزل ذیل میں ملاحظہ ہو۔

تا رفتہ از کنار من    سخت تیرہ است روزگار من
گر دل مرا غم تو داد کہ    ہم تو بود غمگسار من
بی تو غم مارا در میان گرفت    خون دل گذشت از کنار من
صید لاغرم لیک نخت ببین    چشم دام اوست بر شکار من
آنکہ غیر را شمع محفل است    تیرہ کردہ است روزگار من
بر اگر شدم پر عجب مدار    رفتہ آن جوان از کنار من

[1] غزلہای حافظ چاپ تہران ص ۳۲۵۔



ہمچو عندلیب نالہ گر کنم    شور کی شود از ہزار من
روزگار وصل رفت ہمچو گل    یادگار اوست خار خار من
بسکہ خون دل می خورم مدام    لالہ سر زند از مزار من

مزرع فقیر خشک کی شود
ابر رحمت است آبیار من

فقیر دہلوی کی ایک غزل ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔ جو مولانا جامی کی اس مشہور غزل کے جواب میں ہے جسکا پہلا شعر یہ ہے۔

باز ہوای چمنم آرزوست    جلوہ سرو و سمنم آرزوست

اب فقیر دہلوی کی وہ غزل ملاحظہ ہو جس کا مضمون جامی کے مضمون سے مطابقت رکھتا ہے

در نظری او سری گر کنم آرزوست    کوئی مراد در خم گیسو کنم آرزوست
تا کی شود حدوث نقاب رخ قدم    نظارہ دو جوب را مکانم آرزوست
بر آب خضر چشم ندوزم حباب وار    جام محبت سر مردانم آرزوست
در بوستان صحبت گل باغ انما    چو عندلیب طبع غزل خوانم آرزوست
کی چشم من بحسن بتان دوختہ    آئی کہ دو نگار زنت آنم آرزوست
در نوبہار وصل زفیض نسیم شوق    مانند غنچہ چاک گریبانم آرزوست

آوارگی فقیر ز جامی برد ہمرا
چوں گرد باد سیر بیابانم آرزوست

# فقیر بحیثیت مثنوی نگار

صنف شاعری میں مثنوی تمام انواعِ شاعری کی نسبت زیادہ وسیع ہمہ گیر اور مفید ہے۔ شاعری کے سارے مضامین نہایت حسن و خوبی کے ساتھ اس میں ادا ہوتے ہیں۔ مثلاً اخلاقی شاعری، فلسفیانہ، عشقیہ، اور صوفیانہ اور تاریخی شاعری اس کے علاوہ جذبات انسانی، واقعہ نگاری اور مناظر قدرت کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔ مثنوی کا ہر شعر علحدہ ہوتا ہے اسلئے یہ ضروری نہیں ہے کہ پوری مثنوی ایک ہی قافیہ میں لکھی جائے اس کے علاوہ اشعار کی تعداد بھی مقرر نہیں ہے۔ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اہل ایران نے مثنوی نگاری میں عرب کے رجز کی تقلید کی کیونکہ ملک عرب میں مثنوی کوئی مستقل فن نہیں ہے۔ چونکہ رودکی فارسی شاعری کا مقدم الشعراء تسلیم کیا گیا ہے اس لئے مثنوی کا مقدم الشعراء بھی وہی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ رودکی سے قبل کے شعراء کے اشعار نہیں ملتے ہیں۔ رودکی نے کئی مثنویاں لکھیں۔ اس کے بعد فردوسی نے "شاہنامہ" کو سلک نظم میں پرویا۔ نظامی گنجوی نے "سکندر نامہ" "لیلیٰ مجنوں" "خسرو شیریں" وغیرہ مثنویاں لکھیں۔ حکیم سنائی نے "حدیقہ" لکھی۔ اور تصوف میں شیخ فریدالدین عطار کی "منطق الطیر" اور مولانا روم کی "مثنوی معنوی" مشہور ہے۔ امیر خسرو نے بھی کئی مثنویاں لکھیں۔ جو "ہشت بہشت" کے نام سے مشہور رہیں۔

مثنوی نگاری صوفی شعراء کا ایک مخصوص فن ہے۔ کیونکہ اس میں بڑی



وسعت ہے۔ جو غزل میں نہیں ہے۔ صوفی شعراء نے صوفیانہ عقاید اور معرفت و عشق الٰہی کی تعلیم کے لئے مثنوی کو ذریعۂ بیان بنایا۔ فقیر دہلوی بھی چونکہ ایک صوفی شاعر تھا اور صنف مثنوی میں مہارت رکھتا تھا۔ اس لئے اس نے مثنوی گوئی کو اپنا شعار بنایا اور کئی مثنویاں لکھیں اور بہت خوب لکھیں مثنوی نگاری یا غزل گوئی ہر شاعر کے بس کی چیز نہیں۔ عرفی شیرازی جیسا باکمال قصیدہ گو شاعر مثنوی گوئی میں ناکام رہا۔ ذیل کا شعر ملاحظہ ہو۔

مثنوی‌اش رنگ فصاحت نداشت کان نمک بود ملاحت نداشت

لیکن فقیر دہلوی ایک ایسا جامع شاعر تھا کہ جس نے غزلیں، مثنویاں رباعیاں اور ترکیب بند بھی لکھی ہیں۔

مثنوی نگاری کیلئے حسن ترتیب لازمی شے ہے۔ واقعہ کو بہترین طریقہ پر ترتیب دیا جائے تاکہ حقیقی معلوم ہو۔ دوسری چیز کردار نگاری ہے۔ یعنی ہر کردار کو جداگانہ طور پر پیش کیا جائے جیسے خادم اور آقا کا کردار، ایک جوان اور ایک بوڑھے کا کردار، ایک غریب اور ایک متمول کا کردار وغیرہ۔ تیسری بڑی شرط یہ ہے کہ مثنوی نگار کو واقعات کو بیان کرنے میں قدرت حاصل ہو۔ اور وہ گرد و پیش کے ہر واقعہ کو ترتیب کے ساتھ بیان کرے۔ بلاشبہ فقیر دہلوی واقعات نگاری میں بھی ماہر تھا۔ ساتھ ہی ساتھ کردار نگاری اور حسن ترتیب میں بھی ید طولیٰ رکھتا تھا۔ کتابی شکل میں فقیر دہلوی کی چار معرکۃ الآراء مثنویاں غیر مطبوعہ دستیاب ہیں۔ راقم حروف ان مثنویوں کے گہرے مطالعے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ فقیر دہلوی مثنوی گوئی میں بھی ایک بلند و بالا مقام پر فائز تھا۔ اس کی سب سے زیادہ مشہور اور نامور مثنوی "والہ و سلطان" ہے اس مثنوی کا قصہ فرضی نہیں ہے۔ بلکہ فقیر دہلوی کے دوست والہ داغستانی کے داستان عشق کا درد انگیز قصہ ہے فقیر دہلوی نے اس مثنوی میں

جو کچھ بیان کیا ہے وہ اس نے والہ داغستانی سے دریافت کر کے لکھا ہے یہ مثنوی سنہ ۱۱۶۰ھ میں لکھی گئی ذیل کے شعر سے اس مثنوی کا آغاز ہوا ہے۔

ای والہ حسن دلکشت جان — عشق تو بہر دو کون سلطان

فقیر دہلوی نے خود لکھا ہے کہ اس کی یہ مثنوی اس کی دوسری مثنویوں سے بہتر ہے۔ ذیل کا شعر ملاحظہ ہو۔

این نظم ز نظم ہای دیگر — از چند جہت بود نکوتر
اول آنست کاین حکایت — منقول مگشتہ از روایت
نبود چو حکایت سمائی — یا ہم چو فسانہ اختراعی

بلاشبہ اس مثنوی کے اشعار سوز اور درد میں ڈوبے ہوئے ہیں اور جذبات نگاری اور واقعات نگاری اپنے انتہائی کمال پر ہے۔ ہر پڑھنے والا اس مثنوی کے اشعار میں گم ہو جاتا ہے۔ اس کی یہ مثنوی بلاشبہ ایک بلند پایہ عشقیہ مثنوی ہے

اپنی دوسری مثنوی "تحفۃ الشباب" میں بھی فقیر دہلوی ایک پختہ مثنوی گو شاعر معلوم ہوتا ہے۔ فنی حیثیت سے بھی یہ ایک اچھی مثنوی ہے مثنوی "شمس الضحیٰ" میں فقیر نے اپنے مذہبی عقاید اور افکار کو سلک نظم میں پرو دیا ہے۔ یہ ایک صوفیانہ مثنوی ہے۔ اور فقیر دہلوی کے مرد فقیر ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ اس کے اشعار میں ایک تاثیر ہے جو دلوں کو اپنی طرف راغب کرتا ہے۔ اس کی چوتھی مثنوی جو کتابی شکل میں دستیاب ہے "دل مکنون" ہے اس میں قیصر روم کی صاحبزادی نرجس خاتون اور حضرت امام حسن عسکری کی داستان ہے۔ اس مثنوی میں بھی واقعہ نگاری اور جذبات نگاری اپنے انتہائی کمال پر ہے۔ فقیر دہلوی کے دیوان اور کلیات میں ایک مثنوی "در تعریف دولتخانہ نواب امیر الامراء سادات خاں بہادر" ہے۔ اس میں کل ایک سو دس



اشعار ہیں۔ راقم حروف کا خیال ہے کہ یہ مثنوی نواب سعادت خاں سے متعلق ہے کاتب نے غلطی سے سادات خان لکھ دیا ہے۔ اس مثنوی میں فقیر دہلوی نے نواب سعادت کے محل کی تعریف کی ہے۔ اور لکھا ہے کہ اس وقت اس سے بہتر کوئی محل نہ تھا۔ اس کے در و دیوار کی تعریف ذیل کے اشعار سے ہویدا ہے۔

در و دیوار او ز نقش زیبا — زند صد طعنہ بر طاؤس رعنا
اگر بیند بسوی نقش پرکار — شود معنی ز حیرت نقش دیوار

یہ مثنوی واقعہ نگاری کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ فقیر کے کلیات میں ایک مثنوی "تصویر محبت" تقریباً ۵۴۸ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ ایک عشقیہ مثنوی ہے جس میں ایک پان والے کے لڑکے رام چند کے عشق و محبت کی داستان ہے۔ فقیر نے اس مثنوی کو جس انداز میں لکھا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ بھی اس کے حسن سے متاثر تھا یا بہت ممکن ہے کہ اوائل زندگی میں حضرت سرمد شہید کی طرح اس پر عاشق ہو۔ اس مثنوی میں جذبات نگاری اور جوش بیان درجہ کمال پر ہے۔ حمد و نعت کے بعد رام چند کی داستان عشق ہے۔ بعدہٗ اس کی شادی کا ذکر کیا گیا ہے، رام چند غسل کے لیے گنگا ندی میں گیا اور کس طرح اس کی دلہن کو دشمنوں نے ہلاک کر ڈالا اور اس کی نعش جلائی گئی یہ مثنوی ہندوستان کی ہندی تہذیب کو پیش کرتی ہے۔ یہ مثنوی فنی اور معنوی اعتبار سے بہت کامیاب ہے۔ فقیر دہلوی کے دیوان اور کلیات میں ۲۴۰ اشعار پر مشتمل ہے مثنوی "در تعریف خمخانہ" کے عنوان سے ہے۔ اس کی ابتداء ذیل کے شعر سے ہوئی ہے۔

خوشا حسن خانۂ عشرت نشیمن — لطافت راز بویش روح در تن

فقیر دہلوی کے دیوان اور کلیات کا اختتام اسی مندرجہ بالا مثنوی پر ہ

ہوا ہے۔ اس مثنوی میں فقیر نے ایک شاہی خسخانہ کی تعریف کی ہے لیکن مثنوی کے مطالعہ سے یہ بات واضح نہ ہو سکی کہ یہ کس بادشاہ کے خسخانہ کی تعریف ہے۔ آخر کا مصرع ذیل میں نقل کیا جاتا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ "خسرو گردون مکانی" کے خسخانہ کی تعریف ہے۔

شدہ ہر موی او برتن زبانی　　　بمدح خسرو گردون مکانی

فقیر دہلوی کے کلیات میں ایک معرکۃ الآراء مثنوی "در واقعہ جانسوز کربلا" ہے جس میں کل اکیانوے ۹۱ اشعار ہیں۔ اس میں کربلا کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ مثنوی نہایت پرسوز اور درد انگیز ہے۔ کربلا کے تپتے ہوئے صحرا میں کیا کچھ نہ ہوا محسن انسانیت حضرت امام حسینؑ اور آپکے خاندان گرامی کے افراد پر جو ظلم و ستم ڈھائے گئے اس کو سنکر سنگ خارا بھی پگھل جاتا ہے۔ اس مثنوی کی ابتدا ذیل کے شعر سے ہوتی ہے۔

باز از ماہ محرم در جہان　　　تازہ شد داغ مصیبت دوستان

اس مثنوی کے اشعار انتہائی درد و غم میں ڈوبے ہوئے ہیں جذبات نگاری اور واقعہ نگاری اپنے انتہائی کمال پر ہے میدان کربلا میں اہل بیت کی بے سروسامانی کی منظر کشی میں فقیر دہلوی نے نہایت اعتدال سے کام لیا ہے۔ بلاشبہ وہ پر درد داستان کربلا کو بیان کرنے کی خداداد صلاحیت رکھتا تھا۔ اشعار میں بلا کا زور ہے اور منظر کشی کا یہ عالم ہے کہ پڑھنے والے کی آنکھوں کے سامنے میدان کربلا کا نقشہ آجاتا ہے وہ علی اصغر کا پیاسا نہر فرات کے کنارے لے جایا جانا۔ لاشوں کا زمین پر کس مپرسی کی حالت میں پڑا رہنا، خیموں میں آتش زنی اور ریگزار کربلا کا خون سے رنگین ہونا ان سارے واقعات کو فقیر دہلوی نے نہایت بہتر طور پر لکھا ہے اور اس مثنوی سے اہل بیت سے اس کی بے پناہ محبت و عقیدت کا ثبوت ملتا ہے۔



رباعی گو کی حیثیت سے بھی فقیر دہلوی ایک بلند مقام پر نظر آتا ہے۔ اصناف شاعری میں رباعی بھی ایک بلند درجہ رکھتی ہے اور بہت بامعنی اور پرکشش ہوتی ہے۔ گرچہ اس دور میں رباعی گوئی کا فن متروک ہو گیا ہے۔

فارسی شاعری کی دنیا میں سب سے بڑا رباعی گو عمر خیام تھا۔ مختلف نسخوں میں اس کی ۲۷، رباعیاں ملتی ہیں۔ اور کئی زبانوں میں ان کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ جدید اہل تحقیق سے اہل ایران نے ثابت کیا ہے کہ عمر خیام نے بہت کم رباعیاں کہی تھیں، اور دوسرے شعراء کی رباعیاں ان کے نام سے مشہور کر دی گئی ہیں۔

بابا طاہر عریاں اور بابا افضل کوہی بھی رباعی گو شعرا تھے۔ مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ سحابی استرآبادی نے کم از کم ستّرہ[۱] ہزار رباعیاں کہی تھیں ان کے پاس اس کی رباعیوں کا ایک نسخہ تھا جس میں سات ہزار رباعیاں تھیں۔

فقیر دہلوی کی کل ایک سو پچیس[۱۲۵] رباعیاں اسکے دیوان میں ہیں اس کے کلیات میں صرف چھیالیس[۴۶] رباعیاں ہیں۔ اسکے رباعیوں کے گہرے مطالعہ سے یہ بات روشن ہوتی ہے کہ گرچہ وہ رباعی گو شاعر نہیں تھا کیونکہ اسکا اصل سرمایہ غزل ہے۔ لیکن جو رباعیاں اس نے کہی ہیں وہ اپنے فنی اور معنوی اعتبار سے کسی بلند پایہ رباعی گو شاعر سے کمتر نہیں ہیں۔ اس کی بیشتر رباعیاں صوفیانہ ہیں جن میں خدا اور اس کی قدرت کی تعریف کی گئی ہے۔ ذیل میں اس کی چند رباعیاں بطور نمونہ نقل کی جاتی ہیں۔

ای غائب و آشکار چو ذات خدا　　　در عین خفا و چشم معنی پیدا
از ما دل و جان منتظر روی تو ایم　　　بردار نقابی و خدا را بنما

---

۱؎ شعر العجم جلد سوم

دل مست محبت حسین ابن علی است | جان عاشق طلعت حسین ابن علی است
حقیقت اہل بیت بر خلق جہاں | ثابت ز شہادت حسین ابن علی است

در ملک وجود بادشاہ است علی | جان و تن و عقل را پناہ است علی
چشم ہمہ کائنات ختم رسل است | در مردم آن چشم نگاہ است علی

حق را بدل شکستہ منزل گاہ است | از جادۂ انفاس بسویش راہ است
ہان سہل مبین کہ انکسار فقرا | آئینہ کبریائی شاہنشاہ است

فقیر دہلوی نے چند رباعیاں بطور نذر بھی لکھی ہیں جو انکے دیوان میں ہیں۔ اس کے علاوہ چند معمات بھی لکھے ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ فقیر دہلوی کو پہیلی نظم اور معما گوئی میں بھی مہارت تھی۔ ذیل میں اس کی ایک پہیلی نقل کی جاتی ہے۔

زاغی دیدم سیاہ مانند مداد | از دلی مرغی سفید چون برف بزاد
زین طرفہ کہ در جہان آن مرغ سپید | پرواز نمود و بیضہ زرین داد

بے شک فقیر دہلوی ایک قادر الکلام شاعر تھا۔



# باب

## میر شمس الدین فقیر دہلوی کے معاصرین

# نظام الملک آصف جاہ

نظام الملک ، محمد شاہ کے زمانے میں وزیر اعظم کے عہدے پر فائز تھا۔ اس کا نام قمر الدین تھا۔ لیکن محمد شاہ نے وزارت عظمیٰ کے عہدے پر سرفراز کرنے کے بعد اسے آصف جاہ کے خطاب سے نوازا تھا۔

شاہ نواز خاں نے لکھا ہے کہ نظام الملک کی پیدائش سنہ ۱۰۸۲ھ میں ہوئی تھی۔ اس کا دادا عابد خاں حج کے ارادہ سے ہندوستان آیا اور اورنگ زیب عالمگیر سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ حج سے واپسی کے بعد وہ پھر عالمگیر بادشاہ سے ملا اور اس کے دربار میں اعلیٰ منصب پر فائز ہوا۔ دربار میں اس کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ بادشاہ وقت اس کے بیٹے میر شہاب الدین کے ساتھ شہزادوں جیسا سلوک کرتا تھا۔ میر شہاب الدین کی دکن کی لڑائی میں نمایاں خدمات کے صلے میں بادشاہ نے اس کو غازی الدین فیروز جنگ کے خطاب سے سرفراز کیا۔ اس کی شادی شاہجہاں بادشاہ کے وزیر اعظم سعد اللہ خاں کی دختر سے اورنگ زیب نے کرادی جس نے نظام الملک آصف جاہ جیسے ہونہار بیٹے کو جنم دیا۔ نظام الملک نے بڑے ہو کر خان بہادر کا خطاب پایا اور آہستہ آہستہ اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے ترقی کے منازل طے کرتے لگا حتیٰ کہ بادشاہ اورنگ زیب کے مقرب خاص میں شمار کیا جانے لگا۔

تاریخ کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ بہادر شاہ کے دور حکومت میں نظام الملک



نے ملازمت سے سبک دوش ہو کر گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ لیکن فرخ سیر کے تخت نشین ہونے پر اس نے پھر ملازمت قبول کر لی اور نظام الملک کا خطاب پایا۔ سنہ ۱۱۳۲ھ مطابق ۱۷۲۱ء میں جبکہ محمد شاہ تخت پر جلوہ افروز ہوا ، نظام الملک دکن سے دہلی آیا اور اسے وزارت کے علاوہ دکن کی صوبہ داری بھی محمد شاہ نے عطا کی۔ مگر محمد شاہ کے درباریوں میں نفاق دیکھ کر سنہ ۱۱۳۵ھ / ۱۷۲۳ء میں اس نے وزارت چھوڑ دی اور دکن میں اپنی خود مختار ریاست قائم کر لی۔ دوبارہ محمد شاہ نے خوشامد کر کے سنہ ۱۱۴۹ھ / ۱۷۳۷ء میں نظام الملک کو دکن سے دہلی بلایا اور وزیر اعظم کا عہدہ اور آصف جاہ کا خطاب دیا۔

آزاد بلگرامی نے " ریاض الشعراء " کے حوالہ سے لکھا ہے کہ فرخ سیر نے نظام الملک کو ہفت ہزاری کا عہدہ بخشا تھا۔ اس کے علاوہ مالوہ اور مراد آباد کا انتظام بھی اسی کی نگرانی میں تھا۔ اس کی صوبہ داری کے زمانے میں لوگ بڑے آسودہ اور بے فکر تھے۔ شجاعت و بہادری کے ساتھ ساتھ امور حکومت کے معاملہ میں بھی وہ بڑا عقلمند ثابت ہوا۔ وہ اپنی دریا دلی اور فیاضی کے لئے بھی شہرت کا حامل ہے۔ بدحال اور خستہ حال لوگ اکثر دکن جاتے تھے اور نظام الملک کی شاہانہ فیاضی سے فیضیاب ہوتے تھے ـــــ

وزارت عظمیٰ کے عہدہ پر ممتاز ہونے کے علاوہ نظام الملک ایک پختہ مشق شاعر بھی تھا۔ ارباب تذکرہ متفقہ طور پر رقمطراز ہیں کہ نظام الملک پہلے شاکر تخلص کرتا تھا لیکن جب اسے آصف جاہ کا خطاب ملا تو اس نے اپنا تخلص آصف رکھا۔ اس کا دیوان بہت ضخیم ہے اس کے دیوان کا ایک نسخہ خدا بخش لائبریری ، پٹنہ میں ہے۔ آصف

کے اشعار میں درد، سوز اور تڑپ ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں؎

آہ درد آلود می باید مرا | نغمۂ داؤدی باید مرا
تارخ آن ماہِ تاباں بگرم | طالع مسعود می باید مرا

از کوشش بیہودہ میر سید زشاکر
عمر سیت کہ می نالد و تاثیر ندارد

---

تماشای جمال یار دیدن آرزو دارم
چو رشک خود بگوی او دیدن آرزو دارم

قدرت اللہ کا بیان غلط ہے کہ اورنگ زیب نے اس کے دادا عابد خاں کو "چین قلیچ" کا خطاب بخشا تھا۔ "ماٰثرالامراء" اور "ریاض الشعراء" میں مرقوم ہے کہ آصف جاہ کو اورنگ زیب نے "چین قلیچ خاں" کے خطاب سے نوازا تھا۔ ذیل میں "ماٰثرالامراء" کی عبارت نقل کی جاتی ہے جس سے آصف جاہ کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے ۔۔۔"

"علماء و مشائخ دیار عرب و ماوراء النہر و خراسان و عراق و اطراف ہندوستان صیت قدردانی او شنیدہ رو بدکن آوردند[1]"

آصف جاہ کو تعمیر کا بھی بڑا شوق تھا۔ اس نے شہر پناہ برہان پور کا حصار، مسجد، کاروان سرائے اور پل بنوائے تھے۔"

والہ داغستانی کے بیان کے مطابق کم عمری ہی سے آصف جاہ نے شعر گوئی شروع کی تھی اور اس کو شاعروں کی سرپرستی کا بھی شوق تھا۔ یہی وجہ ہے

[1] ماٰثرالامراء۔



کہ میر شمس الدین فقیرؔ جیسا صوفی شاعر بھی آصف جاہ کی فیاضی سے فیض یاب ہونے کے لئے دکن گیا تھا۔ آصف جاہ فقیرؔ دہلوی کی بڑی عزت کرتا تھا۔ علی احمد خاں سندیلوی کا بیان ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

"بسبب فرط محبت کہ نواب نظام الملک با و داشت بدیار دکن رفتہ[1]"

والہؔ داغستانی اور نظام الملک کے درمیان گہرے تعلقات تھے والہؔ نے اپنے تذکرہ "ریاض الشعراء" کی تالیف کے وقت نظام الملک کو ایک خط لکھ کر اس کے حالات زندگی طلب کیا تھا۔ آصف جاہ نے دکن سے اپنے حالات کے ساتھ کچھ اشعار بھی ارسال کئے تھے جن کو والہؔ داغستانی نے "ریاض الشعراء" میں قلم بند کیا ہے ۔۔۔"

"دیوان والہؔ داغستانی" میں دو ایسی رباعیاں مرقوم ہیں جن سے والہؔ اور آصف جاہ کے گہرے تعلقات کا پتہ چلتا ہے؎

آصف بخدا بدت نجوئیم ہرگز | جز راہ محبتت نپوئیم ہرگز
جز عطر عنایتت نبوئیم ہرگز | جز مدح تو مدح کس نگوئیم ہرگز

زاں باز کہ از دکن بمن می آید | گوئی تو کہ جان مرا بتن می آید
خوش آں کہ رسد بگوش جانم والہؔ | ایں مژدہ کہ آصف از دکن می آید

سنہ ۱۱۶۱ھ میں نظام الملک شدید طور پر بیمار رہا۔ اس کا مرض روز بروز بڑھتا چلا گیا۔ اور ۴ رجمادی الآخر سنہ ۱۱۶۱ھ میں اس نے انتقال کیا۔ اس کی آخری آرامگاہ حضرت برہان الدین غریبؒ کے مزار کے پائین میں ہے۔ آزادؔ بلگرامی نے "متوجہ بہشت" تاریخ وفات لکھی ہے۔ اور "ماٰثرالامراء" کے مؤلف نے یہ قطعہ تاریخ رقم کیا ہے:

[1] مخزن الغرائب۔

سر رکن مملکت هند از جهان رفت | فناد حیف سر دریگانه از اعف دهر
برای رحلت این هر سر یافتم تاریخ | نماند شاه زمان با وزیر آصف جاه

# علی قلی خان[2] والہ داغستانی

علی قلی نام اور والہ تخلص تھا۔ خود اس کے ذیل کے شعر سے اس کے نام پر روشنی پڑتی ہے ۔

چون نالۂ من شنید با همدم گفت | از دست علی قلی بتنگ آمده ام

والہ داغستانی نے اپنے تذکرہ " ریاض الشعراء " میں اپنا نام علی قلی ہی لکھا ہے۔[1] میر شمس الدین فقیر[2] دہلوی نے اپنی مثنوی " والہ و سلطان " میں بھی اس کا نام علی قلی مرقوم کیا ہے۔ ذیل میں فقیر کا شعر نقل کیا جاتا ہے:

زان فال سعید نیک انجام | آمد او را علی قلی نام۔

خوشگو[1]، خان آرزو[2]، اور آزاد[3] بلگرامی، نے بھی والہ داغستانی کا نام علی قلی اور تخلص والہ لکھا ہے۔ والہ داغستانی کا خاندانی سلسلہ حضرت عباس رضؓ تک پہونچتا ہے۔ اس سلسلہ میں والہ داغستانی کا شعر نقل کیا جاتا ہے۔

دارد ز زلف کسوت عباسیان ببر | از دودمان ماست رخ دلستان ما[4]

فقیر دہلوی[5]، خان آرزو[6]، اور آزاد[7] بلگرامی کا بھی بیان ہے کہ والہ داغستانی عباسی خاندان سے تھا۔

---

[1] سفینۂ خوشگو [2] مجمع النفائس [3] خزانہ عامرہ [4] دیوان والہ داغستانی رامپور ص ۵۸ [5] والہ و سلطان۔



والہ داغستانی کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہلاکو خاں کے ظلم و ستم سے تنگ آکر عباسی بادشاہوں کے آخری زمانے میں اس کے خاندان کے لوگ حجاز اور ہندوستان کی طرف ہجرت کر گئے۔ لیکن والہ کے آباء و اجداد داغستان میں سکونت اختیار کر لی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی شہرت والہ داغستانی کے نام سے ہے ورنہ اس کی پیدائش اصفہان میں ہوئی تھی۔[1]

الدار خاں شمخال (والہ داغستانی کے پردادا) سے ایران کے بادشاہ شاہ صفی نے کہا تھا کہ اپنے کسی بیٹے کو میرے پاس رہنے دو۔ الدار خاں شمخال نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے الخاص مرزا کو بادشاہ کی خدمت میں روانہ کر دیا۔ شاہی محل میں اس کی تعلیم و تربیت ہوئی اور صفی خان کا خطاب پایا۔

سلطان نجات بیگم سے اس کا نکاح ہوا۔ نجات بیگم کے دو اولاد نرینہ ہوئی۔ نظر علی خان اور مہر علی خان۔ مہر علی خان کے چار بیٹے تھے۔ ان میں سب سے چھوٹے بیٹے محمد علی خان تھے جو والہ داغستانی کے والد تھے۔[2]

---

[1] ریاض الشعراء [2] ریاض الشعراء مخطوطہ ورق ۳۷۴ کتاب خانہ خدا بخش پٹنہ۔

لہ احوال و افکار و آثار علی قلی خاں والہ داغستانی ص ۵۳ بھاگلپور یونیورسٹی لائبریری۔



جن تذکروں میں والہ داغستانی کا ذکر ملتا ہے ان سے بغیر کسی اختلاف کے یہ معلوم ہوتا ہے کہ والہ داغستانی ۱۱۲۴ھ میں اصفہان میں پیدا ہوا والہ نے خود لکھا ہے کہ وہ صفر ۱۱۲۴ھ میں اصفہان میں پیدا ہوا۔

تولدایں فرسودۂ نوایب زمان در شہر صفر ۱۱۲۴ھ در دار السلطنت اصفہان واقع شدہ لہ ۔"

والہ داغستانی کا خاندان ایک نامور اور معزز خاندان تھا۔ اس کے جد سوم (چھر دادا) الدار خان داغستان کے شمخال تھے۔ اور والہ داغستانی کے مطابق شمخال خلیفہ کو کہا جاتا تھا۔ آزاد بلگرامی نے شمخال کے معنی رئیس بتایا ہے۔ والہ کے دادا مہر علی خان امیر شکار باشی تھے۔ اس کے دادا کے چھوٹے بھائی فتح علی خاں منصب وزارت پر فائز تھے۔ اس کے چچا لطف علی خان سپہ سالار ایران تھے۔ ان تمام باتوں کا ذکر والہ نے ریاض الشعراء میں کیا ہے۔ فقیر دہلوی اور والہ داغستانی میں بڑی گہری دوستی تھی۔ والہ کی فرمائش پر فقیر نے ۱۱۶۰ھ میں مثنوی "والہ و سلطان" لکھی۔ جس سے والہ داغستانی کے حالات زندگی پر خاطر خواہ روشنی پڑتی ہے۔ اور چونکہ یہ مثنوی والہ کی زندگی میں ہی قلم بند کی گئی ہے۔ اس لئے دوسرے تذکروں کے مقابلے میں یہ مثنوی زیادہ قابل اعتماد ہے۔ اس مثنوی سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ والہ داغستانی کی ولادت پر اس کے والدین نے خزانے لٹائے اور دعوتیں کیں۔ اس کی پیدائش پر نجومیوں نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ یہ بچہ سعادت مند ہے لیکن ہمیشہ عشق کی وجہ سے پریشان رہیگا —— "

لہ ریاض الشعراء ورق ۳۰۲ب سے مثنوی "والہ و سلطان" ص ۲۳ ۔

اما بود ایں پسر ہمیشہ   شوریدہ مزاج و عشق پیشہ[1]

خدیجہ سلطان والہؔ کی چچازاد بہن تھی۔ وہ نہایت حسین و جمیل تھی، بچپن ہی میں والہؔ اور خدیجہ سلطان کے والدین نے دونوں کا رشتہ طے کر دیا تھا۔ تین سال کی عمر میں والہ داغستانی اپنے والد کے ساتھ کری ایروان چلا گیا۔ کیونکہ اس کے والد وہاں کے بیگلر بیگ (سپہ سالار) مقرر ہوئے تھے وہاں اس نے دو سال گذارے۔ فقیرؔ کا شعر ملاحظہ ہو۔

با اہل و عیال خود دراں شد   از اصفاہان بہ ایروان شد[2]

کری ایروان کے سفر کے بارے میں والہؔ نے بھی ریاض الشعراء میں لکھا ہے۔ اس کے لکھنے کے مطابق اس کے والد ۱۱۲۸ھ میں بیگلر بیگ (سپہ سالار) ہوئے تھے۔ بیک وقت وہ ایروان، آذر بائیجان اور قندھار کے حاکم بھی تھے اس کے والد افغانوں کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوئے لیکن نخجوان میں استسقا کے مرض میں وہ انتقال کر گئے۔ اور حضرت علیؑ کے مزار شریف کے نزدیک مدفون ہوئے جو واقع نجف اشرف میں ہے۔ اس وقت والہ داغستانی کی عمر پانچ سال تھی۔ وہ نہایت رنج و غم کے ساتھ اصفہان واپس آیا اور اپنے چچا حسن علی خاں کے یہاں زندگی گذارنے لگا۔ اور خدیجہ، سلطان سے بچپن ہی میں اسے عشق ہو گیا چھ سال کی عمر میں وہ مکتب میں بیٹھایا گیا۔ فقیرؔ دہلوی کے ذیل کے شعر سے اس بات کا پتہ چلتا ہے۔

والہ چو بشش رسید سالش   دادند بدرس استغالش[3]

اکثر تذکرے اس بات پر خاموش ہیں کہ والہ داغستانی کے استاد کون تھے

---

۱؎ والہ و سلطان، ص ۲۸ - ۲۹ ۲؎ والہ و سلطان ص ۲۳ -
۳؎ والہ و سلطان ص ۲۸ —



خوشگو ہی واحد تذکرہ نگار ہے۔ جس نے لکھا ہے کہ والہؔ داغستانی شیخ حزیںؔ کا مرید اور شاگرد تھا۔

"مرید و شاگرد شیخ محمد علی حزیں ہم براہ شیخ می رود[1]"

والہؔ داغستانی نے شیخ حزیں کے بارے میں بہت کچھ لکھا لیکن یہ نہیں لکھا کہ وہ اس کے استاد تھے[2]۔ البتہ اس نے لکھا ہے کہ اس کو شیخ حزیں سے بڑی عقیدت تھی۔ والہ داغستانی کے دیوان میں دو قصیدے شیخ حزیں کی تعریف میں ہیں۔ مگر ان قصیدوں کے مطالعہ سے یہ ظاہر نہیں ہوتا ہے کہ وہ اس کے استاد تھے۔

خان آرزوؔ[3] نے بھی یہ بات نہیں لکھی ہے کہ وہ شیخ حزیں کے شاگرد تھے۔ والہؔ داغستانی کے والد خط شکستہ اور خوش نویسی میں مہارت رکھتے تھے۔ حاکم لاہوریؔ[4] کا بیان ہے کہ والہ داغستانی خط نویسی میں بے مثال تھا۔ اور تقریر بھی اچھی کرتا تھا۔ کیونکہ یہ خوبی اس کو اپنے آباء و اجداد سے ملی تھی۔ والہ داغستانی کے خاندان کے تمام افراد حکومت کے عہدوں سے برطرف کر دیئے گئے تھے۔ جس کی وجہ سے والہؔ علوم ظاہری میں مہارت حاصل نہ کر سکا۔ اسی سال افغانوں کا زبردست حملہ ہوا۔ قتل و غارت گری نے لوگوں کے ذہن کو تصوف کی طرف موڑ دیا۔

مرزا جعفر بیگ راہبؔ اور والہؔ داغستانی میں بڑی گہری دوستی تھی۔ جب والہؔ داغستانی ہندوستان کے لئے کوچ کر رہا تھا — تو

---

۱؎ سفینۂ خوشگو ص ۲۹۴ ۲؎ ریاض الشعراء - ۳؎ مجمع النفائس ورق ۵۳۳
۴؎ مردم دیدہ مطبوعہ ص ۹۵ - ۵؎ خزانہ عامرہ ورق ۳۴۱ —

مرزا جعفر بیگ راہب نے بھی اس کے ساتھ ہندوستان آنا چاہا۔ لیکن کسی وجہ سے نہ آسکا لیکن جدا ہوتے وقت دونوں کی آنکھیں نم تھیں[1] مصحفی نے والہ داغستانی کو مرزا جعفر بیگ راہب کا شاگرد بتایا ہے۔ لیکن اس میں صداقت نہیں ہے[2]۔ والہ داغستانی کے اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکنے کی نمایاں وجہ اس کا عشق ہے جیسا کہ اس کے شعر سے معلوم ہوتا ہے۔ ؎

تحصیلِ علم و دانش خود بود لیک والہ　　عشق جنون طبیعت فرصت نداد ما را[3]

والہ کے اس بیان میں اس کی خاندانی انکساری کو زیادہ دخل ہے۔ کیونکہ فقیر دہلوی، حسین دوست، خوشگو، خان آرزو، حاکم لاہوری، مصحفی، ابوطالب، سکری بلگرامی، قدرت اللہ اور مولانا شبلی جیسے اہل قلم حضرات اس کی علمی صلاحیت کے معترف ہیں۔

بھگوان داس ہندی کے بیان کے مطابق مرزا محمد منشی، والہ داغستانی[4] کا استاد تھا جو علم فقہ، حدیث، حکمت، تصوف جفر و رمل، ریاضی و موسیقی میں مہارت رکھتا تھا وہ پانچ زبانیں جانتا تھا اور تیرہ قسم کی تحریر لکھتا تھا۔ وہ نادر شاہ کا خزانچی تھا۔ لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی میں بھی اس کی شہرت تھی۔ شعر و شاعری سے بھی اسے دلچسپی تھی۔ وہ منشی تخلص کرتا تھا۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ نادر شاہ نے کسی بات پر ناراض ہو کر اسے دہلی میں تہہ تیغ کر دیا۔ والہ داغستانی نے بھی اپنے استاد مرزا محمد منشی کے بارے میں

۱ خزانۂ عامرہ ورق ۱۸۳ ۲ ریاض الشعراء ورق ۱۶۲ – ۷۵ب – ۷۶ب –
۳ احوال و افکار و آثار والہ داغستانی ص　بھاگلپور یونیورسٹی لائبریری ۴ مقالات شبلی ص ۱۲۹ –



اسی قسم کی باتیں تحریر کی ہیں۔ والہ نے منشی سے کلیات نوائی اور چند رسالۂ معمہ پڑھا تھا اور اس کے سامنے نسخ تعلیق کی مشق بھی کی تھی[1]۔

والہ داغستانی نظم و نثر دونوں صنف میں مہارت رکھتا تھا خصوصاً زبان کی شیرینی اور صفائی قابل تعریف ہے۔ گرچہ اس کی مادری زبان فارسی تھی لیکن زبان ترکی میں بھی اس کے چند اشعار ملتے ہیں۔ ایک رباعی اردو (برج بھاشا) میں اور اس کی ایک رباعی غزلی میں بھی دستیاب ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اس نے کسی قدر اردو بھی سیکھ لی تھی اور اسے اردو سے نفرت نہیں تھی۔

فقیر دہلوی کے بیان کے مطابق والہ داغستانی نے صرف نو سال تحصیل تعلیم کے بعد وہ شہرت حاصل کی جو کم ہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ ذیل میں فقیر کا ایک شعر نقل کیا جاتا ہے۔

زین سان نہ سال چوں بسر شد
ہر اک زکمال مایہ ور شد[2]

۱۱۳۳ھ میں محمود افغان نے اصفہان کے گرد فوج جمع کر لی تھی، اور ۱۱۳۵ھ میں اصفہان پر محمود افغان کا قبضہ ہو گیا۔ اس قبضے کے بعد والہ داغستانی کے خاندان کے لوگ قید میں ڈالے گئے اور رعایا بھی بہت پریشان رہی۔ والہ داغستانی نے یہ دن بڑی پریشانیوں میں گزارا۔ محمود افغان کے حکمران ہونے کی وجہ سے والہ داغستانی کی شادی اس کی چچیری بہن خدیجہ سلطان سے نہ ہو سکی۔ بلکہ محمود افغان کے ایک شناسا

۱ ریاض الشعراء، ورق ۷۶ – ۷۳ب ۲ والہ و سلطان ص ۳۰ –

افغان سے ہوگئی ۔ جو اس کی ملازمت میں تھا ۔ آزاد بلگرامی[40] نے اس کا نام کریم داد لکھا ہے ۔ والہ داغستانی کو اس خبر سے بہت افسوس ہوا ۔ اب خدیجہ سلطان سے اس کی ملاقاتوں کا سلسلہ بند ہو چکا تھا ۔ لیکن شادی کے بعد خدیجہ سلطان اپنی سسرال نہیں جانا چاہتی تھی کیونکہ اس کو بھی والہ داغستانی سے عشق تھا ۔ یہ بات عوام میں مشہور ہوگئی ۔

فقیر دہلوی کا بیان ہے کہ شادی کے بعد بھی والہ داغستانی خدیجہ سلطان کے یہاں جاتا رہا ۔ لیکن جب تھوڑے ہی دنوں کے بعد ایران پر نادر شاہ کا قبضہ ہوگیا تو والہ داغستانی نے ایران کو ترک کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا ۔ اس کے ترک وطن کی دوسری وجہ یہ بھی کہ سارے اصفہان میں اس کی عزت کی دھجیاں اڑائی جانے لگی کہ وہ خدیجہ سلطان سے ملتا جلتا ہے ۔ اس لئے اس نے مجبور ہو کر سفر ہند کا ارادہ کیا ۔ خود اس نے لکھا ہے کہ ۱۱۴۶ھ میں وہ ٹھٹھ کے بندرگاہ پہونچا ۔ لیکن محمد علی تبریزی تھامس ویلیم بیل، اسپرنگر، ڈاکٹر ایتھے اور ڈاکٹر علی رضا نقوی نے لکھا ہے کہ وہ ۱۱۴۷ھ میں ہندوستان آیا ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے "ریاض الشعراء" کو بغور نہیں پڑھا ورنہ ایسی غلطی نہ ہوتی ۔ ذیل میں والہ داغستانی کا بیان نقل کیا جاتا ہے ۔[41]

"در سال ورود فقیر بہ ہندوستان کہ ۱۱۴۶ھ بود بدست زن مغنیہ کہ در ہندوستان بہ تعلق خاطر نگاہ داشت بود بہ تحریک اغیار مسموم و در مقبرہ برہان الملک مرحوم در شاہجہان آباد مدفون گردید ـ"

[40] ریاض الشعراء ورق ۱۸۹-۱۱ ـ [41] خزانہ عامرہ ورق ۳۴۰ ـ



والہ داغستانی نے مندرجہ بالا باتیں میرزا ہد علی سخا کی زندگی کے حالات کے سلسلہ میں قلم بند کیا ہے ۔ والہ داغستانی ٹھٹھ سے خدا آباد (لاڑکانہ) بھکر، ملتان، اور لاہور میں تھوڑے دنوں کی اقامت کے بعد دہلی کا رخ کیا ۔ آزاد بلگرامی کی ملاقات والہ داغستانی سے لاہور میں ۱۱۴۷ھ میں ہوئی تھی اور دونوں لاہور سے ساتھ ہی سفر طے کر کے دہلی آئے تھے لیکن ۱۱۴۷ھ سے اپنی وفات تک والہ داغستانی زیادہ تر دہلی میں اقامت گزیں رہا ۔ تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک دو بار وہ اودھ گیا تھا لیکن پھر دہلی واپس چلا آیا تھا ۔

والہ داغستانی نے خود ہی لکھا ہے کہ محمد شاہ نے اس کو چار ہزاری منصب، دو ہزار سوار، جاگیر، اور خدمت میر توزک بخشا تھا ۔ والہ داغستانی نے ذیل کی رباعی محمد شاہ کو لکھ کر بھیجی تھی

شاہا والہ روز سیاہی دارد
در یاب کہ احوال تباہی دارد
راہش نہ دہد بدر گہت گردش چرخ
خوش آنکہ بحضرت تو راہی دارد[42]

ڈاکٹر عبدالغفار انصاری نے والہ داغستانی کی ایک مہر کی نقل بھی اپنے مقالہ میں پیش کیا ہے جو ان کو آقای جعفر سلطان القرائی کے ذاتی کتب خانہ، تبریز میں ملی تھی ۔ اس مہر سے یہ بات ثابت ہوتی ہے ۔ کہ والہ داغستانی واقعی محمد شاہ مغل بادشاہ ہندوستان کی ملازمت میں ایک بلند مقام پر فائز تھا ۔ ذیل میں راقم حروف اس مہر کی نقل درج کرتا ہے ۔"

[42] احوال و افکار و آثار والہ داغستانی ص ۳۴۴ ـ
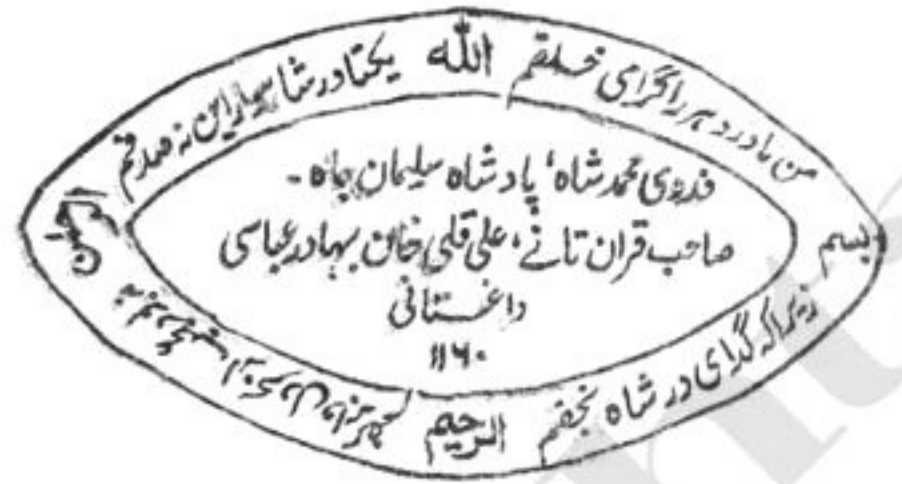
احمد شاہ نے والہ داغستانی کو چھ ہزاری منصب اور خان زمان بہادر ظفر جنگ کا خطاب دیا تھا[۱] -

عالمگیر ثانی بادشاہ نے والہ داغستانی کو ہفت ہزاری منصب سے سرفراز کیا تھا[۲] - والہ داغستانی کو اپنی محبوبہ خدیجہ سلطان سے اپنی زندگی کے آخری دنوں تک عشق رہا - کیونکہ وہ ہمیشہ ہندوستان میں رہ کر بھی اپنی محبوبہ کو یاد کرتا رہا - اس نے وقتاً فوقتاً اپنی محبوبہ کے پاس قاصد بھی بھیجا - لیکن اکثر مایوسی ہوئی - کیونکہ کوئی بھی قاصد خدیجہ سلطان کے شوہر کے ڈر سے خدیجہ سلطان تک خط پہونچانے میں کامیاب نہیں ہوتا تھا -

والہ داغستانی کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف سبحانہ نام کی ایک رقاصہ ہی خدیجہ سلطان تک خط پہونچانے میں اور وہاں سے جواب لانے میں کامیاب ہو سکی ذیل کے شعر سے اس بات پر روشنی پڑتی ہے -

چا بک پیکی سبحانہ نامی  حرحر روشنی صبا خرامی
سوی تو روانہ کردم بودم  جبر غش بخدا نہ کردم بودم[۳]

والہ داغستانی کے ذیل کے اشعار سے اس کے اور خدیجہ سلطان کے عاشقانہ

[۱] مردم دیدہ ص ۱۰۰ [۲] نتائج الافکار [۳] دیوان والہ داغستانی رامپور ص ۲۳۳ -



تعلقات ظاہر ہوتے ہیں ۔۔ ۔

چہ پرسی برای کہ دیوانہ گشتم  برای خدیجہ برای خدیجہ[۱]
چوں ہست بطالعم جنونی  دیوانہ او چرا نہ باشم[۲]
من آں بلبل بی نصیبم کہ آخر  نہ شد روزیم سیر باغ خدیجہ[۳]
خواہم بسوی خدیجہ پرواز کنم  اما چہ کنم کہ بال و پر نیست مرا[۴]

بلا شبہ خدیجہ سلطان کو بھی والہ داغستانی سے والہانہ عشق تھا۔ وہ بھی شاعرہ تھی اور اپنی ذیل کی رباعی میں اس نے اپنے عشق کا اظہار کیا ہے

افسانۂ درد من اگر گوش کنی  از لیلیٰ و داستانش خاموش کنی
در قصۂ درد ابن عم شنوی  مجنوں و حکایتش فراموش کنی[۵]

اپنے شوہر مرزا احمد، وزیر اصفہان کے مقتول ہونے کے بعد وہ والہ داغستانی سے شرف ملاقات کے لئے اصفہان سے روانہ ہوئی - لیکن راہ ہی میں شہر کرمان شاہان میں اس کی وفات ہو گئی - اور والہ داغستانی سے اپنی موت کے وقت بھی ملاقات نہ کر سکی[۶] -"

والہ داغستانی اور خدیجہ سلطان کے معاشقہ کے بہت سارے قصے مشہور ہیں - فقیر دہلوی نے لکھا ہے کہ والہ داغستانی نے ایک بار خدیجہ سلطان سے ملنے کے لئے گدا کا بھیس اختیار کیا - ہاتھوں میں کشکول لیا اور ٹاٹ کا لباس پہن کر خدیجہ سلطان کی سسرال پہنچ کر اس سے ملاقات کی ذیل میں فقیر دہلوی کا ایک شعر نقل کیا جاتا ہے

تحقیق کنید کہ ایں گدا کیست  وز ایں ہمہ زاریش غرض چیست[۷]

[۱] دیوان والہ داغستانی رامپور [۲] [۳] ریاض الشعراء [۴] خزانۂ عامرہ -
[۵] والہ و سلطان خطی نسخہ نمبر ص ۱۱۱ و ۱۳۰ اس شعر کو خود خدیجہ سلطان نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے
(احوال و آثار و افکار علی قلی خاں والہ داغستانی ص ۲۴۵ بحوالہ پٹنہ یونیورسٹی لائبریری) [۶]

محمد علی خاں انصاری کا بیان ہے کہ گنا بیگم والہ داغستانی کی بیٹی تھی جس کا نکاح عماد الملک غازی الدین خاں وزیر عالمگیر ثانی سے ہوا تھا اور تاریخ عماد السعادت[1] سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ گنا بیگم رام جنی کے بطن سے تھی۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ والہ داغستانی نے رام جنی سے شادی کر لی تھی۔ تذکروں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ رام جنی ایک طوائف تھی۔ گنا بیگم دختر والہ داغستانی نو سیری کے نام سے بھی مشہور تھی کیونکہ بہت دبلی پتلی تھی ــ "

والہ داغستانی نے دہلی میں سنہ ۱۱۶۹ھ میں وفات پائی۔ گلشن علی جونپوری کے ذیل کے شعر سے تاریخ نکلتی ہے ؎

سال وصال او بازیں گونہ گفت گلشن
ما دردِ عشق والہ از این جہاں جدا شد[2]

حاکم لاہوری، آزاد بلگرامی، اور مصحفی نے اس کی وفات سنہ ۱۱۷۰ھ میں لکھا ہے لیکن گلشن علی جونپوری چونکہ اس کے وفات کے وقت موجود تھا اس لیے اس کا بیان زیادہ صحیح ہے۔ ویسے ایک سال کا فرق کوئی فرق نہیں ہے۔ ڈاکٹر عبد الغفار انصاری نے لکھا ہے کہ انہوں نے دہلی میں والہ داغستانی کی قبر کو بہت تلاش کیا لیکن اس کا کوئی پتہ نہیں چلا ــ "

راقم حروف نے بھی دہلی کے بعض مشہور مقامات میں اس کی قبر کے بارے میں دریافت کیا لیکن بڑی مایوسی ہوئی۔

" والہ داغستانی ایک عاشق دلفگار تھا۔ اور ایک ممتاز شاعر

---

[1] تاریخ عمادۃ السعادت مطبوعہ ص ۱۳۴ [2] گلشن علی جونپوری والہ داغستانی کی ملازمت میں تھا اور اس نے اس کی وفات پر ایک مرثیہ لکھا جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے حبیب گنج سیکشن کے نسخہ ریاض الشعراء پر مرقوم ہے اس مرثیہ سے ۱۱۶۹ھ کی تاریخ نکلتی ہے [illegible] ہی لکھا ہے ــ



بھی تھا۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ عشق ہی نے اس کو شاعر بنایا اور اس کے اشعار میں درد اور سوز پیدا کیا۔ اس کا دوسرا بڑا کارنامہ مشہور تذکرہ "ریاض الشعراء" ہے جس میں انہوں نے تقریباً پچیس سو[1] فارسی شعرا کا ذکر کیا ہے۔ یہ تذکرہ اس دور کے اہم ترین تذکروں میں سے ایک ہے جس سے خصوصاً اس عہد کے فارسی شعرا کے حالات پر تفصیلی روشنی پڑتی ہے۔ آخر میں راقم حروف والہ داغستانی کے ایک شعر پر اس کے ذکر کو ختم کرتا ہے ؎

گفتی کہ علی قلی بہ دراین غلط است
موہوم تو بر دمن نخواہم مردن[1]

## ۳
## شیخ محمد علی حزیں

نام محمد علی اور تخلص حزیںؔ تھا۔ اس کی پیدائش سنہ ۱۱۰۳ھ میں اصفہان میں ہوئی تھی[2]۔ اس کے سال ولادت میں اختلاف ہے۔ بعض تذکروں میں اس کا سال ولادت سنہ ۱۰۹۲ھ لکھا ہے[3]۔ پروفیسر براؤن اور خان آرزو کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے والد کا نام ابو طالب تھا۔ چونکہ حزیںؔ کے آبا و اجداد نے بہت دنوں تک لاہیجان میں قیام کیا تھا اسی مناسبت سے اسے لاہیجی بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے پردادا شیخ وحدت علی لاہیجی تھے پروفیسر براؤن[4] کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ حزیںؔ کے والد علم حاصل کرنے کے مقصد سے اصفہان آئے اور شادی کر کے وہیں مقیم ہو گئے۔ اس وقت

---

[1] والہ داغستانی رامپور [2] ریاض الشعراء [3] خم خانۂ جاوید جلد دوم ص ۳۹۵ - [4] A Literary History of Persia - Vol. IV

ان کی عمر ۲۰ سال تھی۔ حزیںؔ تین بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔"
والد کے مرنے کے بعد اس کی والدہ بھی اس جہان فانی سے کوچ کر گئیں۔

چار سال کی عمر میں حزیںؔ نے پڑھنا لکھنا شروع کیا۔ خداداد ذہانت کی وجہ سے اس نے تمام علوم میں مہارت حاصل کرلی۔ والدین کا سایہ اوائل شباب میں ہی سر سے اٹھ گیا۔ اس لئے اس نے آبائی دولت کو بے دریغ خرچ کیا۔ ممتاز اور نامور شعراء اور اہل علم کی صحبت سے استفادہ بھی کیا گرچہ مفلس و قلاش ہو گئے تھے۔

۱۱۴۵ھ میں نادر شاہ نے جب ایران پر حملہ کیا تو حزیںؔ وہاں سے بھاگ کر افغانستان، سندھ، ملتان، اور لاہور کے راستوں سے دہلی چلا آیا۔ نواب عمدۃ الملک امیر خاں انجامؔ کی سفارش پر محمد شاہ نے اسے کچھ جاگیر دیدی۔ دہلی میں اس نے چودہ سال تک قیام کیا۔ پھر آصف الدولہ کے وقت میں بنارس چلا آیا۔

صاحب "ریاض الشعراء" نے حزیںؔ کی بڑی تعریف کی ہے۔ اس کے بیان کے مطابق اس عہد میں حزیںؔ جیسا سخنور دنیا میں موجود نہ تھا ذیل میں اس کا بیان ملاحظہ ہو۔"

"الحق امروز سخندانی مثل او در روی زمیں وجود ندارد، پایۂ سخن را بجای رسانیدہ کہ شہباز اندیشہ در تصور رفعتش پر می ریزد"[1]

حاکمؔ لاہوری کی ملاقات حزیںؔ سے بنارس میں دو مرتبہ ہوئی تھی۔ اس کی صحبت میں حاکمؔ نے کچھ وقت بھی گذارا تھا۔ حاکمؔ لاہوری نے بھی حزیںؔ کی بڑی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ اس جیسا اس زمانہ میں کوئی نہ تھا۔[2]

---

[1] ریاض الشعراء ورق ۱۰۳ [2] مردم دیدہ ص ۶۶



آزادؔ بلگرامی کا بیان ہے کہ علوم عقلی و نقلی میں اس کا پایہ بہت بلند تھا شاعری میں بھی دستگاہ رکھتا تھا۔ شیخ حزیںؔ کی زبان کی صفائی اور فصاحت کی بھی آزادؔ نے تعریف کی ہے۔"

بندرابن داس خوشگوؔ کا یہ دعویٰ ہے[1] کہ بنارس میں ایک مرتبہ حزیںؔ سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے حزیںؔ کو فرشتہ سیرت، خلوت نشین اور صوفی مزاج جیسے کلمات سے نوازا ہے۔"

"شیخ حزیںؔ کے بارے میں رضا قلی خاں ہدایتؔ نے صرف اسقدر لکھا ہے:-

"نامش شیخ محمد علی و از احفاد شیخ زاہد گیلانی بہندوستان رفتہ معزز زیست"[2]

منشی غلام حسین خاں طباطبائی نے لکھا ہے کہ حزیںؔ کے فضائل کی پوری دنیا میں شہرت پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی تصنیفات کا شہرہ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ساری دنیا میں ہے اس کے علوم ظاہری و باطنی کے معترف عرب و عجم کے ناقدین بھی ہیں۔ اس کی قوت حافظہ بہت تیز تھی۔ عمدۃ الملک امیر خاں انجامؔ اور دوسرے امیروں کے ذریعہ محمد شاہ نے حزیںؔ کو وزارت کا عہدہ قبول کرنے کا پیغام بھیجا۔ لیکن اس نے قبول نہیں کیا تھا۔ اسے ظاہری عزت و شان و شوکت کی تمنا نہیں تھی۔

ڈاکٹر ذبیح اللہ صفاؔ نے حزیںؔ کی شاعری کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے

"سخن او متوسط و مقرون بسادگی و روانی و حد فاصلیست میان شیوۂ سخن شاعران قدیم و شیوۂ کہ بسبک ہندی معروفست"[3]

---

[1] سفینۂ خوشگو [2] مجمع الفصحا، جلد دوم [3] گنج سخن جلد سوم —

کہا جاتا ہے کہ حزیں نے سات سال کی عمر میں شوکت بخاری کے جواب میں ایک غزل کہی تھی ۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ حزیں کے والد (ابوطالب) کے مکان پر کچھ شاعر جمع تھے ۔ ان میں سے ایک نے محتشم کاشی کی ایک غزل کا مطلع پڑھا ۔ ؎

این گردنِ بلند قد آن در کمند تو

رعنای آفریدۂ قد بلند تو

جب مولانا حسن نے حزیں سے اس کے جواب میں مطلع کہنے کو کہا تو حزیں نے برجستہ کہا ۔ ؎

صید از حرم کشد خم جعد بلند تو　　فریاد از تطاول مشکین کمند تو

مولانا حسن نے فرطِ محبت سے شیخ حزیں کی پیشانی کو بوسہ دیا ۔ اور تمام لوگ محوِ حیرت ہو گئے ۔ حزیں کے والد نے حزیں کو اسی وقت سے شعر کہنے کی اجازت دیدی ۔ "

پروفیسر براؤن کے بیان کے مطابق شیخ حزیں دس سال تک تہران ، گیلان ، آذربائجان ، مشہد ، کردستان ، ہمدان ، نہاوند ، خرم آباد ، کرمان شاہ وغیرہ کا سفر کرتا رہا ۔ اور اسی دوران اس نے حج بھی کیا ۔ "
حزیں کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۱۴۶ھ میں ہندوستان کیلئے روانہ ہوا تھا[1] ۔ "

بادشاہ وقت ، امراء اور تمام لوگ شیخ حزیں کے ساتھ خلوص اور محبت سے پیش آتے تھے ۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ محمد شاہ سے چالیس ہزار روپئے کی جاگیر نواب عمدۃ الملک امیر خاں انجام نے حزیں کو دلوائی تھی اور

---

[1] تذکرۃ الاحوال حزیں ۔ مطبوعہ ۔



محمد شاہ نے کسی موقع پر حزیں کو پانچ لاکھ روپئے بخشا تھا ۔

صاحب " ریاض الشعراء " لکھتے ہیں کہ شیخ حزیں سے انکی دوستی تھی لیکن حزیں کی برائی یہ تھی کہ اس نے ہندوستان کے بادشاہ ، امیروں اور عوام کی شان میں ہجو کے اشعار کہا تھا ۔ والہ داغستانی شیخ حزیں سے بہت عقیدت رکھتا تھا اس لئے اس نے اس کو اس حرکت نازیبا سے باز رکھنے کی کوشش کی اور ہجو کے اشعار کہنے سے منع کیا لیکن حزیں نے اپنی روش نہیں بدلی ۔ اس لئے والہ داغستانی نے حزیں سے قطع تعلق کر لیا اور اس سے ملنا جلنا ترک کر دیا ۔ سراج الدین علی خاں آرزو نے حزیں کے دیوان سے غلط اشعار نکالا ۔ اور رسالہ " تنبیہ الغافلین " میں اس پر تنقید کیا تا کہ حزیں کا مقام کم تر ہو جائے ۔ آزاد بلگرامی نے لکھا ہے کہ اہل ہند کی ہجو لکھنے کے بعد جب حزیں نے لوگوں کو اپنے خلاف پایا تو دہلی سے اس کا دل اچاٹ گیا ہے اور وہ اکبر آباد چلا گیا ۔ کچھ دنوں تک وہاں رہنے کے بعد اس نے بنگال کا قصد کیا ۔ لیکن پھر بنگال کا ارادہ ترک کر کے بنارس کا رخ کیا ۔ بنارس اسے بہت پسند آیا جس کا اظہار اس کے اس شعر سے ہوتا ہے ۔

از بنارس نروم معبد عام است اینجا

ہر برہمن پسر لچھمن و رام است اینجا

صاحب " مردم دیدہ " نے لکھا ہے کہ حزیں نے بنارس میں گرچہ لباس فقیری اختیار کر لیا تھا لیکن اس کا رہن سہن امیروں کا سا تھا ۔

حزیں اور والہ داغستانی کے تعلقات کا ثبوت اس واقعہ سے بھی ملتا ہے کہ جب لاہور کے صوبہ دار زکریا خاں نے کسی بات پر حزیں کو سزا دینا چاہا تو والہ داغستانی نے اس کی مدد کی اور سزا سے بچا لیا ۔ اسی طرح جب وقت نادر شاہ

ہندوستان آیا اس وقت حزیںؔ لاہور میں تھا۔ نادر شاہ کے آنے کی خبر سن کر شیخ حزیںؔ بہت پریشان اور ہراساں ہوا اس لئے وہ لاہور سے دہلی آیا اور والہؔ داغستانی کے گھر میں پناہ گزیں ہوا۔

شیخ حزیںؔ کے سال وفات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بھگوان داس[1] ہندی نے لکھا ہے کہ حزیںؔ نے سنہ ۱۱۶۷ھ میں وفات پائی۔ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا[2] کے مطابق حزیںؔ کا سال وفات سنہ ۱۱۸۱ھ ہے۔ لیکن پروفیسر براؤن[3]، غلام حسین خاں[4]، عبدالمقتدر[5]، اور آزاد بلگرامی[6] نے متفقہ طور پر لکھا ہے کہ حزیںؔ نے سنہ ۱۱۸۰ھ میں وفات پائی۔ "خزانۂ عامرہ" اور "تبصرۃ الناظرین" کے مطابق حزیںؔ کی وفات ۱۱ رجمادی الاول سنہ ۱۱۸۰ھ کی شب میں ہوئی۔ بنارس میں حزیںؔ نے اپنے لئے خود ہی قبر بنوائی تھی۔ انتقال کے بعد سے اسی قبر میں دفن کیا گیا۔ حزیںؔ کی قبر پر مندرجہ ذیل اشعار کندہ ہیں جنہیں منشی غلام حسین خان اور عبدالمقتدر نے حزیںؔ کے اشعار بتایا ہے ؎

زبان دان محبت بودہ ام دیگر نمی دانم
ہمی دانم کہ گوش از دوست پیغامی شنید اینجا

حزیں از پای رہ پیما بسے سرگشتگی دیدم
سر شوریدہ بر بالین آسائش رسید اینجا

روشن شد از وصال تو شبہای تار ما
صبح قیامت است چراغ مزار ما

پروفیسر عبدالغفار انصاری نے مجھ سے کہا کہ انہوں نے ۱۹۶۶ء میں شیخ حزیںؔ

---

[1] سفینۂ ہندی، [2] گنج سخن جلد سوم، [3] A Literary History of Persia.
[4] سیرۃ المتاخرین جلد دوم [5] کٹلاگ خدابخش لائبریری، پٹنہ جلد سوم ص ۲۲۷ [6] خزانۂ عامرہ۔



کی قبر پر مندرجہ بالا اشعار کندہ دیکھا تھا۔ آزادؔ بلگرامی نے حزیںؔ کی وفات پر قطعۂ تاریخ کہی تھی جس سے سال وفات سنہ ۱۱۸۰ھ نکلتا ہے۔ وہ قطعۂ تاریخ وفات ذیل میں نقل کی جاتی ہے ؎

علامۂ عصر و شاعر خوب
افسوس کہ از میانہ برخاست

تاریخ وفات او نوشتم
از فوت حزیںؔ حزیں دل ما ست

حزیںؔ کی بزرگی اور اس کی علمی صلاحیت کا اعتراف تمام تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔ اس کے شاگردوں میں ملا باقر شہید، آغا طاہر شیرازی گلشن علی جونپوری اور راجہ رام نرائن موزوں کے نام آئے ہیں۔

"حدائق المعانی"[1] کے سرورق پر قاضی عبدالودود مرحوم و مغفور کے منجھلے بھائی قاضی محمد سعید مرحوم و مغفور نے خواجہ عبداللہ تمنا عظیم آبادی پر اردو زبان میں ایک نہایت مختصر سا نوٹ لکھا ہے جس میں تمنا عظیم آبادی کو حزیںؔ کا شاگرد بتایا ہے۔

گرچہ تذکروں میں حزیںؔ اور فقیر دہلوی کے تعلقات کا کوئی ذکر نہیں ہے لیکن قیاس ہے دونوں میں تعلقات ضرور رہے ہونگے۔ نادر شاہ کے حملہ کے وقت (سنہ ۱۱۵۱ھ میں) حزیںؔ لاہور سے دہلی آیا تھا اور والہؔ داغستانی کے مکان پر پناہ گزیں تھا۔ فقیرؔ دہلوی، والہؔ داغستانی، کا عزیز ترین دوست تھا اور نادر شاہ کے حملہ کے وقت وہ بھی دہلی میں تھا اسلئے اس بات کا بہت زیادہ امکان ہے کہ فقیرؔ دہلوی کی ملاقات شیخ حزیںؔ سے ہوئی ہو۔

---

[1] "حدائق المعانی" ایک قلمی ضخیم بیاض ہے جس میں خواجہ محمد علی تمنا ابن خواجہ عبداللہ تمنا عظیم آبادی نے فارسی شعراء کا کلام باعتبار حروف تہجی مرتب کیا ہے۔

## تصنیفات شیخ حزیں

۱۔ تذکرۃ المعاصرین
۲۔ سہ۳ دیوان
۳۔ تذکرۃ الاحوال مشہور بہ تاریخ ایران حزیں
۴۔ رسالہ ابرام در بیان قضا و قدر و خلق اعمال

آخر میں حزیں کے چند اشعار نمونہ کے طور پر لکھے جاتے ہیں

دلم جاری نسازد زاں نگہ اشک جگر گوں را
ز زخم تیغ زہر آلودہ بیروں کے دہد خوں را

---

از سوز نالہ ام دل جاناں خبر نداشت
آں شاخ گل ز مرغ خوش الحان خبر نداشت

---

بدل از بس غبارم بودِ آں نازنین ریزد
برنگ سرمہ از چشم نگاہِ واپسیں ریزد



## سراج الدین علی خان آرزو[۱]

صاحب "ریاض الشعراء" نے لکھا ہے کہ آرزو کا نام سراج الدین علی خاں تھا اور سنہ ۱۱۰۱ھ میں اس کی ولادت ہوئی تھی۔ اس کی جای پیدائش اکبر آباد (آگرہ) ہے۔ والہ داغستانی نے اس کا اصل وطن گوالیار بتایا ہے لیکن ملازمت کی وجہ سے سنہ ۱۱۳۲ھ میں وہ دہلی آیا اور سنہ ۱۱۶۱ھ میں بھی وہ دہلی ہی میں تھا۔ اس کے آبا و اجداد کا خاندانی سلسلہ حضرت شیخ نصیر الدین محمودؒ چراغ دہلی سے اور والدہ محترمہ کی طرف سے حضرت شیخ محمد غوثؒ گوالیاری تک پہونچتا ہے۔ وہ کم عمری سے ہی علم حاصل کرنے میں مشغول تھا اور سن شعور میں شعر کہنا شروع کیا تھا۔ اپنے عہد کے مشہور عالموں سے اس نے چوبیس ۲۴ سال کی عمر تک تحصیل علم کیا اس کے بعد اس کو شاہی عہدہ ملا۔ دربار کے امیروں کی نظر میں اس کی عزت تھی وہ بے فکری کی زندگی گذارنے کا قائل تھا بذلہ سنجی، حسن ادا اور بدیہہ گوئی کے علاوہ اور کئی صفات میں اس کی شہرت تھی۔ امیر حسن دہلوی نے لکھا ہے کہ امیر خسرو کے بعد آرزو جیسا خوشگو، صاحب علم و فن اور پرگو شخص پیدا نہیں ہوا۔ گرچہ امیر حسن نے کچھ مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آرزو صاحبِ علم و فن تھا

---

[۱] تذکرہ شعرائے اردو۔ مطبوعہ۔ ص ۴۱ - ۴۲ -

آنند رام مخلص کی سفارش سے محمد شاہ نے آرزو کو ایک بلند عہدہ بخشا تھا
شجاع الدولہ نے ۱۱۸۶ھ میں اسے تین سو روپئے کا سالانہ وظیفہ دیا تھا
اسی طرح نجم الدولہ سے اسے ڈیڑھ سو روپئے ماہوار کا ایک وظیفہ ملا تھا
خان آرزو نے[1] لکھا ہے کہ تقریباً چونتیس سال کے عرصہ سے فقیر دہلوی
سے اس کی ملاقات تھی اور وہ (فقیر) اسکے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آتا تھا۔
اس کے تعلقات فقیر کے ساتھ نہایت مستحکم اور استوار تھے۔

حاکم لاہوری نے "مردم دیدہ" میں خان آرزو کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس وقت فقیر دہلوی جیسا شاعر ہندوستان میں نہیں تھا۔ غرض کہ خان آرزو نے دوستی اور اخلاص کا پورا حق ادا کیا اور فقیر کو ہندوستان کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا۔ لیکن راقم حروف کا خیال ہے کہ خان آرزو نے اپنے تذکرہ میں اپنے دوست فقیر دہلوی کی تعریف میں کچھ مبالغہ سے کام لیا ہے۔

یہ درست ہے کہ اس عہد میں حزیں جیسا شاعر ہندوستان اور ایران میں بھی نہیں تھا۔ لیکن چونکہ خان آرزو سے حزیں کے تعلقات اچھے نہیں تھے اس لیے خان آرزو نے حزیں کی وہ تعریف نہیں کی جس کے وہ مستحق تھے۔ اور اپنی کتاب "تنبیہ الغافلین" میں حزیں کی شاعری پر نکتہ چینی کی۔

مختلف تذکروں کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آرزو نے ۲۳ ربیع الثانی ۱۱۶۹ھ میں لکھنؤ میں انتقال کیا لیکن اس کی نعش کچھ مدت تک لکھنؤ میں رکھی گئی اور بعد میں دہلی میں اسے دفن کیا گیا۔
آزاد بلگرامی نے اس کی وفات پر تاریخ کہی جسے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

سراج الدین علی خان استاد بشر ۔۔۔ ز مرگ او سخن را آبرو رفت

---

[1] مجمع النفائس۔



اگر جوید کسی سال وفاتش ۔۔۔ بگو آن جان معنی آرزو رفت
۱۱۶۹

ارباب تذکرہ لکھتے ہیں کہ خان آرزو کے دیوان میں تین ہزار اشعار ہیں۔ اشعار سے ظاہر ہے کہ اسے شاعری پر قدرت حاصل تھی۔ اس کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

جز لعل یار خویش ندیدم آرزو ۔۔۔ آن قطرۂ شراب کہ بیہوشی آورد
نہ رفت حسرت پابوس تو از دل ہیچ ۔۔۔ بخاک تفتہ ما ہیچ کس گذار نداشت
صوفیان را می رسد آفت ز نفس خویشتن ۔۔۔ ہمچو آن کرمی کہ ضائع می کند پشمینہ را
دوزخ شود افسردہ تر از سینہ نہاد ۔۔۔ گر از دل عاشق نفس سرد بر آید

## تصنیفات و تالیفات آرزو

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱ | مجمع النفائس | ۲ | دیوان فارسی |
| ۳ | چراغ ہدایت | ۴ | شرح سکندر نامہ |
| ۵ | عطیۂ کبریٰ | ۶ | خیابان |
| ۷ | موہبت عظمیٰ | ۸ | شرح قصائد عرفی |
| ۹ | تنبیہ الغافلین | ۱۰ | شرح مختصر للمعانی |
| ۱۱ | شرح گل کشتی میر نجات | ۱۲ | جواب اعتراضات منیر |
| ۱۳ | غرائب اللغات | | |

# ۵
# قزلباش خان امیدؔ

قزلباش خان امیدؔ، فقیرؔ دہلوی کے گہرے دوستوں میں سے تھا۔ وہ ایک رنگیں بیان اور شیریں زبان شاعر تھا۔ تذکرہ "بے نظیر"، "ریاض الشعراء"، "نتائج الافکار" اور "سفینۂ ہندی"، کے مصنف نے امیدؔ کا اصل نام محمد رضا اور وطن ہمدان بتایا ہے۔ ان تذکروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کی پیدائش ہمدان ہی میں ہوئی تھی۔ لیکن خوشگو نے اس کی جای پیدائش اصفہان لکھا ہے۔ صاحبِ "ریاض الشعراء" کے بیان کے مطابق اس کی پرورش و پرداخت اصفہان میں ہوئی۔ بعض تذکرہ نگار معترف ہیں کہ وہ اپنے وطن ہمدان سے اصفہان چلا گیا تھا۔ والہ داغستانی نے لکھا ہے کہ وہ بہادر شاہ کے جلوس کے اوائل میں ہندوستان آیا اور ذوالفقار خان کی طرف سے ہزاری منصب اور قزلباش خان کا خطاب پایا۔ اس طرح محمد رضا، قزلباش خان امیدؔ کے نام سے مشہور ہو گیا۔

امیدؔ علم موسیقی میں بھی بڑی مہارت رکھتا تھا اور اس زمانے کے بڑے بڑے استاد بھی اس کی عزت کرتے تھے اس کا دل عشق کے نالوں اور شور و شیون سے لبریز تھا۔ جس محفل میں وہ پہنچتا تھا اس میں جان آ جاتی تھی۔ اسکو دیکھتے ہی دوستوں کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی تھی۔ امیدؔ قناعت پسند شخص تھا ہزاری منصب ملنے پر اسے خوشی نہیں تھی جس کا اظہار اس



نے ذیل کے شعر میں کیا ہے ؎

ہمچو بلبل ہمیشہ نالا نیم ۔۔۔ این بود منصب ہزاری ما

عبدالوہاب نے تذکرہ "بے نظیر" میں امیدؔ کی رنگین بیانی اور شیریں زبانی کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ ہندوستانی موسیقی سے وہ اچھی طرح واقف تھا اس کے سات ہزار اشعار دستیاب ہیں۔ قدرت اللہ نے لکھا ہے کہ امیدؔ پاکیزہ طینت، خوش اخلاق اور رنگین مزاج تھا۔ اس نے حج بھی کیا تھا اور مذہب سے بھی اسے گہرا لگاؤ تھا —

قزلباش خاں امیدؔ کے نظام الملک آصف جاہ سے بھی گہرے تعلقات تھے۔ آصف جاہ نے اس کو دکن میں ایک اعلیٰ منصب پر فائز کیا اور الماس کے کان کی داروغگی کا عہدہ بھی اسے ملا تھا۔

صاحب "نشتر عشق" نے لکھا ہے کہ جب نظام الملک ۱۱۴۸ھ میں دہلی آیا اس کے ہمراہ قزلباش خاں امیدؔ اور میر شمس الدین فقیرؔ بھی تھے۔

"تا پنج سالِ سیاحت اورنگ آباد (دکن) و دیگر بلاد نمودہ
ہمراہ قزلباش خاں امیدؔ تخلص مراجعت بوطن خود ساخت[1]"

فقیرؔ اور امیدؔ کے درمیان گہرے تعلقات تھے کیونکہ مندرجہ بالا بیان سے یہ بات ثبوت کو پہونچتی ہے کہ امیدؔ اور فقیرؔ دکن سے دہلی تک ۱۱۴۸ھ میں ساتھ ہی آئے تھے۔ ان دونوں کے درمیان محبت اور دوستی کا پتہ چلتا ہے۔ تذکرہ نگاروں کا متفقہ بیان ہے کہ امیدؔ کی وفات ۱۱۵۹ھ میں ہوئی۔ اس کی وفات اس دور کے شعراء علماء اور امراء کو انتہائی غم ہوا۔ کیونکہ امیدؔ

---

[1] نشتر عشق۔

نہایت خوش مزاج تھا اور اس کے تعلقات تمام لوگوں کے ساتھ بہت استوار تھے جب کسی ایسے خوش مزاج اور پسندیدہ اطوار شخص کی وفات ہو جاتی ہے تو ہر شخص رنج و غم میں شریک ہوتا ہے۔ امید کی موت سے ہر شخص متاثر ہوا۔ فقیر دہلوی نے بھی اپنے دوست امید کی موت پر ایک دردناک مرثیہ کہا تھا جسے ذیل میں رقم کیا جاتا ہے۔ سه

واحسرتا دریغا کز جور تیشہ مرگ
از پا فتادہ ناگاہ سرو روان امید
بیرا ہستی عزیزان در مرگ او کبود ست
گلہائے یاس آورد فصل خزان امید
میر آب باغ ہستی در خشک سال دانش
آب حیات ببرید از بوستان امید
بر شاخسار معنی چون بلبل آشیاں داشت
چون نقش پا ست اکنون خاک آشیان امید
جستم فقیر از عقل تاریخ ایں مصیبت
گفتا کہ گشت بی آب باغ جنان امید

اس کی ملاقات اکثر و بیشتر فقیر سے ہوتی تھی۔ والہ داغستانی نے لکھا ہے کہ دونوں کے درمیان نہایت اچھے اور دوستانہ روابط تھے۔ امید کی وفات سے والہ داغستانی کو بھی انتہائی صدمہ ہوا۔ خود والہ داغستانی کا بیان ہے کہ اس کی وفات کو ایک سال سے زیادہ کا عرصہ گذر چکا تھا لیکن رنج و غم میں کوئی کمی نہ ہوئی تھی۔ اس نے بھی اپنے دوست امید کی موت پر یہ قطعہ کہا تھا۔



| | |
|---|---|
| از رفتن امید دلم خون شد و رفت | با اشک ز راہ دیدہ بیرون شد و رفت |
| چشم اشک فشاں کہ قطرہ بود چہ شد | دل خندہ زنان کہ قطرہ جیحون شد و رفت |

# شاہ فقیر اللہ آفرین لاہوری

تذکروں میں آفرین لاہوری کے حالات بہت تشنہ ہیں۔ آزاد بلگرامی[1] اور مصحفی[2] کے بیان کے مطابق اس کی جائے پیدائش لاہور ہے۔ حاکم لاہوری نے بھی آفرین کو لاہوری بتایا ہے۔ لیکن خان آرزو نے اس کے وطن سے لاعلمی کا اقرار کیا ہے مفصل حالات کسی تذکرہ نگار نے نہیں لکھے ہیں۔

حاکم لاہوری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آفرین، صائب، اور ناصر علی کے طرز میں اکثر و بیشتر مشق سخن کرتا تھا۔ علم رمل اور علوم عربیہ میں اسے مہارت حاصل تھی۔ شعر و شاعری کا اس کو بہت شوق تھا وہ اساتذہ کے اشعار خوب پڑھتا تھا وہ کسی شاعر کے شعر کو برا نہیں سمجھتا تھا اور سب کی تعریف کرتا تھا۔ آزاد بلگرامی نے آفرین کے بارے میں لکھا ہے۔

"شاعری بود معنی آفرین و شائستہ صد ہزار آفرین از مردم فناجیہ است"

والہ داغستانی کا بیان ہے کہ سخن سرائی میں آفرین کو بڑی شہرت تھی اور وہ سراپا

[1] خزانۂ عامرہ [2] عقد ثریا۔

دردتھا۔ ایسی دردمندی بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود خود کو ہیچ اور کمتر سمجھتا تھا۔

بندرابن داس خوشگو[1] نے لاہور میں آفریںؔ سے ملاقات کرنا چاہا تھا لیکن ملاقات نہ ہو سکی۔ اس نے آفریںؔ کی مدح میں ایک غزل لکھ کر آفریںؔ کے پاس بھیج دیا۔ اس غزل کو پڑھ کر آفریںؔ کو بڑی مسرت ہوئی تھی۔ اس غزل کے چند اشعار نقل کرتا ہوں۔ ؎

برکمال از آفریںؔ باد از دو عالم آفریںؔ
آفریں صد آفریں بل صد ہزاران آفریںؔ
شاہ لاہور سخن مالک رکاب ملک نظم
کز سپاہ لفظ و معنی کوس زد در روم و چین
ای ز شاگردان درگاہ تو استادان وقت
کرد استاد جہان شاگرد رب العالمین

"عقد ثریا" میں مصحفیؔ نے آفریںؔ کے بارے میں لکھا ہے: ـــ

"در معاصرین خویش شاعر شیریں زبان و قائل فصاحت بیان گزشتہ"

خان آرزوؔ کے بیان سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ آفریںؔ، آزاد، متوکل اور خوش مشرب تھا۔ لاہور کے صوبہ دار خصوصاً زکریا خان بہادر اور عبد الصمد خان بہادر کی نظروں میں اس کی بڑی عزت تھی۔ اس کی زبان بہت اچھی تھی لیکن وہ لوگوں سے بہت کم ملتا جلتا تھا۔ آفریںؔ کے شاگردوں میں حاکم لاہوری، عزیز ترین شاگرد تھا۔ آفریںؔ کسی کی تعریف میں شعر نہیں کہتا

---

[1] سفینۂ خوشگو ۔



تھا۔ لیکن حاکمؔ لاہوری کی شادی کے موقع پر مبارکباد کے طور پر اس نے ایک غزل لکھی تھی جس کا پہلا اور آخری شعر نقل کیا جاتا ہے۔ ؎

بگو بحاکم ما ای صبا مبارکباد زما و ز ارض و سما مبارکباد
چنیں کہ صورت و معنی ز تست ای حاکم ز آفریںؔ و ہم از اولیا مبارکباد[1]

سنہ ۱۱۴۳ھ اور سنہ ۱۱۴۷ھ میں آزاد بلگرامی کی ملاقات آفریںؔ سے لاہور میں ہوئی تھی[2]

آفریںؔ نے لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا تھا اور گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ نواب عبد الصمد خاں نے دو مرتبہ آفریںؔ سے ملاقات کرنی چاہی لیکن آفریںؔ نے ملنے سے انکار کر دیا۔ اپنے ایک مخلص کی پیروی سے آفریںؔ نے عبد الصمد خان سے ملاقات کی۔ نواب مذکور نے آفریںؔ کی بڑی تعظیم و تکریم کی اور اپنے مسند کے پاس بیٹھایا اور ایک روپیہ روزانہ وظیفہ جاری کیا[3]"

آفریںؔ کے شاگردوں میں شاہ عبد الحکیم حاکمؔ لاہوری۔ ملا نصیحؔ، فصاحتؔ اور عنقاؔ کا نام بطورِ خاص شہرت کا حامل ہے۔

آفریںؔ نے سنہ ۱۱۵۴ھ میں انتقال کیا اور اپنے گھر میں دفن ہوا۔ آزاد بلگرامی اور قدرت اللہ نے بھی سال وفات سنہ ۱۱۵۴ھ ہی لکھا ہے۔ لیکن مصحفی نے سالِ وفات سنہ ۱۱۵۰ھ لکھا ہے جو غلط ہے۔

حاکم لاہوری نے قطعۂ تاریخ کہا جس کے اس مصرع سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔ ؎ "رفت نقاد معنی از عالم"

آفریںؔ جب بستر مرگ پر تھا تو حاکم لاہوری نے حضرت امام حسینؓ کی منقبت میں ایک قصیدہ آفریںؔ کو سنایا تھا۔ اس قصیدہ کو سن کر آفریںؔ کی آنکھیں

---

[1] [3] مردم دیدہ ۔ [2] سرو آزاد ۔

نم ہوگئی تھی ۔ قصیدہ کے دو اشعار ملاحظہ ہوں ۔ ؎

چوں سبحہ کہ بگسلد و برزمین فتد ۔ می گشت عمر و مانند بلا جابجا گرہ
خوش زبان زمانہ می کہ پی یاد وعدہ ام ۔ می زد ز لطف یار بہ بند قبا گرہ

آفریں نے اپنی پرنم آنکھوں کے ساتھ یہ شعر پڑھا تھا ۔

جہان را نہ ماندنی کرد خدا ۔ یکی می رود دیگر آمد بجا

"سفینۂ خوشگو" میں لکھا ہے کہ آفریں نوّے سال کی عمر میں بھی خضاب لگاتا تھا ۔ کسی نے اس کی وجہ دریافت کی تو فی البدیہہ اس نے یہ شعر کہا ۔

دشمن زندگی است موی سفید
روی دشمن سیاہ باید کرد

●

## تصنیفات آفریں

۱ ۔ ہیر رانجھا ۔
۲ ۔ انسان معرفت ۔
۳ ۔ مثنوی ابجد فکر ۔
۴ ۔ دیوان مشتمل بر قصائد و غزلیات ۔

واحد نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے ۔



# عمدۃ الملک امیر خاں انجام

انجام کے حالات زندگی عبرت انگیز ہیں ۔ محمد شاہ نے اس کو بلند عہدہ دیا تھا جس کی وجہ سے دیگر امراء کو اس سے جلن ہوگئی تھی ۔ وہ حاضر جوابی، طبیعت کی رسائی اور سخن فہمی میں اپنی مثال آپ رکھتا تھا ۔

صاحب "تذکرہ بے نظیر" کا بیان ہے کہ مغل بادشاہ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں انجام کے والد بائیس سال تک کابل میں نظامت کے عہدے پر مامور رہے ۔ تذکروں سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اس کے رشتہ دار ہندوستان اور ایران دونوں ممالک میں بلند عہدوں پر فائز تھے

محمد شاہ کو انجام سے انتہائی محبت تھی اس لئے ایک لمحہ کے لئے بھی وہ اس کو اپنی نظروں سے دور نہیں رکھنا چاہتا تھا لیکن تذکروں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آخری دنوں میں دونوں کے تعلقات کشیدہ ہوگئے اور محمد شاہ کو انجام سے نفرت سی ہوگئی ۔ امراء کے بہکانے کی وجہ سے محمد شاہ، انجام کا دشمن ہوگیا تھا ۔ امراء ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ بادشاہ، انجام کا خیر خواہ بنا رہے ۔ انجام کی شہرت و عزت میں روز افزوں ترقی کی وجہ سے دربار کے امراء نے سیاسی چالیں شروع کیں ۔

ارباب تذکرہ نے لکھا ہے کہ ایک شب انجام نشہ کی حالت میں اپنی رہائش گاہ کی چھت سے گر گیا جس سے وہ شدید زخمی ہوا ۔ ایک

مدت تک بستر علالت پر رہنے کے بعد وہ صحت یاب ہوا۔ چونکہ وہ بہت کمزور ہو گیا تھا اور کھڑا رہنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا اس لئے جب بھی دربار میں آتا تھا جلد ہی لوٹ جاتا تھا۔ اس کے علاوہ گفتگو کے وقت سرداروں کو بادشاہ کی خدمت میں جس طرح رہنا چاہیئے انجام اس کا لحاظ نہیں کرتا تھا دربار کے امراء کے رشک و حسد کا بھی ایک یہ بڑا سبب تھا۔ آصف جاہ اور قمرالدین خاں وزیر اعظم نے محمد شاہ کو آگاہ کیا کہ انجام کی موجودگی میں وہ لوگ بادشاہ کے دربار میں حاضر نہیں ہونگے۔ محمد شاہ نے مجبوراً انجام کو الہ آباد کا صوبہ دار بنا دیا۔ لیکن آصف جاہ ایک سال کے بعد دکن میں مسند نشین ہوا اس لئے محمد شاہ نے انجام کو دوبارہ اپنے پاس بلا لیا۔

عمدۃ الملک امیر خاں انجام، محمد شاہ سے اتنا قریب تھا کہ محمد شاہ نے صفدر جنگ کے بیٹے شجاع الدولہ کا نکاح جب اسحاق خاں کی بیٹی سے طے کیا تو انجام کو اسحاق خاں کی بیٹی کے جہیز کے ساز و سامان کی خریداری کے لئے مقرر کیا۔ بھگوان داس[1] ہندی نے انجام کی شان و شوکت اور اعلیٰ طرز رہائش کا ذکر کیا ہے۔ منشی غلام حسین[2] خاں نے لکھا ہے کہ انجام حکمرانی کے امور میں بڑی صلاحیت رکھتا تھا اور اپنے جیسا کسی کو نہیں سمجھتا تھا

یہ بات مشہور ہے کہ ایک بار انجام نے چند مقدموں کو محمد شاہ کی خدمت بہت طول دے کر پیش کیا ہے اس لئے محمد شاہ اس کو سننے سے دل برداشتہ ہو گیا۔ اس نے انجام سے کہا کہ اس مقدمہ کو وہ دوسرے دن سنے گا۔ مگر انجام نے کہا کہ چند باتیں اور ہیں انہیں عرض کرتے دیجیے۔

---

[1] سفینۂ ہندی [2] سیرۃ المتاخرین۔



محمد شاہ نے دوبارہ اس کو اس سے روکا لیکن اس نے پھر وہی حرکت کی۔ اس طرح تین مرتبہ محمد شاہ نے آگے کچھ کہنے سے باز رکھنا چاہا۔ لیکن انجام کسی انجام کا خیال کئے بغیر اپنی ضد پر اٹل رہا۔ اس پر روز افزوں خان ناظر کی زبان سے ایسا کلمہ نکل گیا جو انجام کی عزت کے لائق نہ تھا۔ انجام نے کہا کہ غلام کو میرے اور بادشاہ کے درمیان لب کشائی کی ہمت کیسے ہوئی ؟ سے روز افزوں خان نے کہا کہ ناچیز بادشاہ کا غلام ہے کسی اور کا نہیں ہے۔ انجام بادشاہ سے مخاطب ہوا کہ اگر روز افزوں خان، ناظر کے منصب پر رہے گا تو وہ دربار میں آنا بند کر دیگا۔ محمد شاہ نے کہا کہ آپ ہی کے خیال کے مطابق ہوگا۔ پھر انجام نے جواب دیا کہ ناظر کا منصب مجھے دیا جائے۔ محمد شاہ نے اسے قبول کر لیا۔ لیکن انجام کے دربار سے رخصت ہونے کے بعد محمد شاہ نے روز افزوں خان سے مل کر ایک سازش کی جس کے تحت یہ طے پایا کہ جواہر نامی بدمعاش کو مقرر کیا جائے تاکہ انجام کو قتل کر دیا جائے ۲۲ ذی الحجہ ۱۱۵۹ھ کی صبح میں جواہر نے انجام کو اس وقت زخمی کیا جب وہ دیوان خاص میں داخل ہو رہا تھا۔ زخم کی تاب نہ لا کر انجام اسی وقت راہیِ ملک عدم ہو گیا۔ اس کی نعش پالکی میں اس کے گھر پہنچائی گئی

انجام کے قتل کے بعد ایک دوسرا دردناک اور عبرت انگیز منظر رونما ہوا۔ محمد شاہ کے خدام انجام کا مال و اسباب لینے کی غرض سے اس کے یہاں گئے مگر انجام کے سپاہیوں نے مال و اسباب لے جانے سے روکا اور اپنی تنخواہ کا مطالبہ کیا۔ نوبت یہاں تک پہونچی کہ سپاہیوں نے اس کی نعش کو بھی دفن کرنے سے روک دیا۔ محمد شاہ کا خیال تھا کہ انجام کے گھر کا سارا سامان اس کے تصرف میں آجائے اور اس کے سپاہیوں اور

ملازموں کو تنخواہ بھی نہ ملے ۔ انجامؔ کے ان رشتہ داروں کو بھی اس کے سپاہیوں نے گھر میں روک لیا جو کفن دفن کے لئے آ گئے تھے ۔ آخر صفدر جنگ نے اپنے آدمیوں کو انجامؔ کے گھر بھیجا اور اس کے سپاہیوں اور ملازموں کو اس بات کا اطمینان دلایا کہ ان کی بقایا رقم وہ اپنی جیب سے دیگا بشرطیکہ انجام کی نعش کو تجہیز و تکفین کی اجازت دیدی جائے ۔ انجام کی موت کے چوتھے دن جب بات طے پا گئی تب اسے مقبرہ خلیل اللہ خاں میں دفن کیا گیا ۔

بعض امراء کے مشورہ سے بادشاہ نے حکم دیا کہ انجامؔ کے محل کے تمام اسباب فروخت کر کے اس کے سپاہیوں اور ملازموں کی تنخواہ ادا کر دی جائے ۔ چنانچہ اس کے محل کے سامان تقریباً بیس لاکھ روپئے میں بیچے گئے اور سپاہیوں اور ملازموں کو ان کی تنخواہیں ادا کی گئیں ۔

بھگوان داس ہندی اور قدرت اللہ متفق ہیں کہ انجامؔ ۱۱۵۹ھ میں مقتول ہوا تھا ۔ " غم عمدہ " سے تاریخ وفات نکلتی ہے ۔ والہ داغستانی نے لکھا ہے کہ انجامؔ کے قاتل جواہر کو بھی اسی وقت قتل کر دیا گیا تھا ۔ بہت ممکن ہے کہ محمد شاہ نے انجامؔ کے قاتل جواہر کو اپنے حکم سے قتل کرا دیا ہو تاکہ محمد شاہ پر لوگ شبہ نہ کریں ۔

انجامؔ کبھی کبھی شعر و شاعری بھی کرتا تھا اور اس کا تخلّص انجامؔ تھا لیکن افسوس کی بات کی ہے کہ راقم حروف کو اس کے اشعار نہیں ملے اور نہ تو کسی کتاب خانہ میں اس کا دیوان ہی ملا ۔ شاعری کے علاوہ اسے ہندوستانی موسیقی میں بھی مہارت تامہ حاصل تھی اور بڑے بڑے استاد فن بھی اس کی عزت کرتے تھے ۔ اس کی قیافہ شناسی کا یہ عالم تھا کہ کسی کی پیشانی دیکھ کر اس کی حالت کا اندازہ لگا لیتا تھا لیکن قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ انجام



خود اپنے انجام سے بے خبر تھا ۔ "

●

# ۸
# شاہ عبدالحکیم حاکمؔ لاہوری

شاہ عبدالحکیم حاکمؔ لاہوری ۱۱۲۰ھ میں بمقام مراد آباد اس عالم آب و گل میں آیا ۔ فرخ سیر کے دور سلطنت میں وہ اپنے والد شادماں خاں کے ہمراہ لاہور گیا اور اس کے والد محترم نے وہیں بود و باش اختیار کر لی ۔

مصحفی کا بیان ہے کہ اس کی دادی کا نام سیدہ تھا اور وہ بلخ کے نامور قاضی میر یوسف کی صاحبزادی تھیں اس کے والد کی وفات لاہور ہی میں ہوئی اس وقت حاکمؔ لاہوری کی عمر پندرہ سال تھی ۔

شاہ عبدالحکیم کو بعض تذکرہ نگاروں نے حکیم بیگ خاں کہا ہے اس کا تخلص حاکمؔ تھا ۔ ۔ ۔ "

بندرا بن داس خوشگو نے لکھا ہے کہ حاکم لاہوری کے والد لاہور کے صوبہ دار تھے ۔ خود حاکمؔ کا بیان ہے کہ اس کے والد شادماں خان ، عالمگیر بادشاہ کے عہد میں بلخ سے ہجرت کر کے دکن آئے اور ان کو ایک ممتاز عہدہ ملا ۔ عالمگیر بادشاہ کے انتقال کے بعد اس کے والد مراد آباد میں سکونت پذیر ہو گئے جہاں ۱۱۲۰ھ میں حاکمؔ کی ولادت ہوئی ۔

حاکمؔ کو کم سنی ہی سے شعر و شاعری کا شوق تھا وہ آفریں لاہوری کا شاگرد

سفینہ خوشگو / مطبوعہ

تھا۔ حاجی محمد شریف قدس سرہٗ اس کے پیر و مرشد تھے۔ ارباب تذکرہ نے متفقہ طور پر لکھا ہے کہ حاکم نے آفرین لاہوری سے فن شعر میں اصلاح لی تھی واله داغستانی اور حاکم لاہوری کے درمیان دید و شنید تھی۔
ایک بار واله داغستانی[1] ایک غزل کی مشق کر رہا تھا جس کا ایک شعر یہ ہے۔

آب حیات و کیمیا عمر دوبارہ و وفا
ایں ہمہ می رسد بہم یار بہم نمی رسد

اسی وقت حاکم لاہوری واله داغستانی سے ملاقات کرنے پہنچا۔ واله داغستانی نے اپنی وہ غزل سنائی اور حاکم سے اسی رنگ میں کچھ کہنے کی فرمائش کی۔ حاکم نے اس بحر میں ایک غزل کہی جس کے چند اشعار ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں۔

یاد زمانہ ی کہ من گل بجز ال بچیدمی — موسم گل بہیں کنون خار بہم نمی رسد
پنجۂ عشق چاک زد بس کہ بلباس ہستیم — دست بجیب ارزنی تا نہ بہم نمی رسد
صبر و قرار جان و دل مصرع ذالہم بود — ایں ہمہ می رسد بہم یار بہم نمی رسد

حاکم کا بیان ہے کہ واله داغستانی اس کے مندرجہ بالا اشعار سن کر بہت خوش ہوا مصحفی نے لکھا ہے کہ حاکم نے اپنے تذکرہ کا نام پہلے "تحفۃ المجالس" رکھا تھا لیکن آزاد بلگرامی کے مشورہ سے اس کا نام بدل کر "مردم دیدہ" رکھا۔ حاکم کا بیان ذیل میں رقم کیا جاتا ہے:۔

"ایں رسالہ را بموجب فرمودۂ میر صاحب آزاد مردم دیدہ نام نہادم"[2]

حاکم کا یہ تذکرہ اس دور کے بعض شعراء کے حالات سے واقفیت کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ اس تذکرہ میں انہیں شعراء کا ذکر ہے جن سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔

---
[1] احوال و افکار و آثار واله داغستانی [2] مردم دیدہ ص ۱۰۱۔



حاکم کو مولانا روم سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ مثنوی معنوی کا اتنا مطالعہ کرتا تھا کہ مرد عارف ہوگیا تھا۔ شجاع الدولہ کے لشکر میں وہ ایک منصب پر تھا لیکن بعد میں اس نے دنیاداری ترک کردی اور صوفی ہوگیا۔ اس نے حج بھی کیا تھا۔ وہ قانع طبیعت اور فطرتاً صوفی مزاج تھا۔ واله داغستانی نے ایک مرتبہ ایک ہزار روپیہ حاکم کے سفر دہلی کے لئے بھیجا تھا لیکن حاکم نے اس کو اپنی قناعت پسندی کی وجہ سے واپس کر دیا تھا۔ اس نے ۱۱۷۱ھ میں قصبہ رائے بریلی میں گوشۂ انزوا اختیار کیا۔ اکثر تذکروں[1] میں ہے کہ ۱۱۸۳ھ میں حاکم نے وفات[2] پائی تھی۔ لیکن لچھمی نرائن شفیق نے لکھا ہے کہ ۱۱۷۰ھ میں کشمیر کے مقام تھتہ میں اس نے رحلت کی۔ لچھمی نرائن شفیق کا بیان صحیح ہے کیونکہ اس نے اس سلسلے میں نور العین واقف لاہوری کے ایک خط کو نقل کیا ہے۔ جو حاکم لاہوری کی وفات کے وقت تھتہ میں حاکم لاہوری کے پہلو میں تھا اور اس کی تجہیز و تکفین میں بھی شریک تھا۔ آزاد بلگرامی نے حاکم لاہوری کی شخصیت سے متاثر ہو کر کہا تھا

سخن پرداز خوش تحریر حاکم[3]

●

---
[1] نتائج الافکار [2] گل رعنا قلمی خدابخش [3] مردم دیدہ مطبوعہ ص ۱۶۔

# ۹ میر غلام علی آزاد بلگرامی

میر غلام علی آزاد بلگرامی کی پیدائش بروز اتوار ۲۵ صفر ۱۱۱۶ھ
میں بلگرام کے محلہ میدان پورہ میں ہوئی تھی[1]۔ آزاد بلگرامی نے بھی اپنی
تاریخ ولادت ۲۵ صفر ۱۱۱۶ھ ہی بتایا ہے[2]۔ تذکروں سے معلوم ہوتا ہے
کہ آزاد بلگرامی نے میر طفیل محمد بلگرامی سے درسی کتابیں پڑھیں۔ میر طفیل
محمد بلگرامی اپنے زمانے کے مشہور استادوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ عروض و
قافیہ اور ادب کی کچھ کتابیں آزاد بلگرامی نے اپنے ماموں میر سید محمد سے
پڑھیں اور لغات و حدیث کا درس اپنے نانا میر عبد الجلیل بلگرامی سے
لیا۔ مدینہ منورہ میں شیخ حیات سندھی سے صحاح ستہ کی سند حاصل
کی۔ شیخ عبد الوہاب طنطاوی مصری سے بھی مدینہ منورہ میں احادیث
کا درس لیا۔ وہ مسجد نبوی میں اکثر راتوں کو صحیح بخاری کے مطالعہ میں
وقت گذارتا تھا۔

آزاد بلگرامی کا سلسلۂ نسب سید محمد صغریٰ سے جا ملتا ہے۔
سید محمد صغریٰ خواجہ بختیار کاکی کا مرید تھا اور اسے سلطان التمش کے دربار
سے تعلق تھا[3]۔ ارباب تذکرہ نے متفقہ طور پر آزاد بلگرامی کو واسطی

---

[1] [3] مقالات شبلی [2] سرو آزاد۔



سید بتایا ہے۔ اپنے نسب کے متعلق آزاد بلگرامی نے خود لکھا ہے۔
"آزاد الحسینی نسباً والواسطی اصلاً والبلگرامی مولداً و منشاء
والحنفی مذہباً والچشتی طریقۃ"
۱۱۴۲ھ میں آزاد بلگرامی اپنے ماموں میر سید محمد سے شرف ملاقات
حاصل کرنے کی غرض سے دہلی، لاہور اور ملتان کا سفر کرتا ہوا سیوستان
پہنچا جہاں میر سید محمد کو بادشاہ وقت سے میر بخشی اور وقائع نگار کے
عہدے پر فائز کیا گیا تھا۔ سیوستان سندھ کا ایک شہر ہے۔ آزاد کا یہ سفر
ایک سال تین مہینے میں پورا ہوا تھا۔ میر سید محمد نے آزاد کو اپنا قائم مقام
بنا کر بلگرام کے سفر کا آغاز کیا اور چار سال کے بعد وہ سیوستان واپس
آیا تھا۔ ۱۱۴۷ھ میں آزاد سیوستان سے دہلی آیا اس سفر میں والہ داغستانی
کا ساتھ لاہور سے دہلی تک رہا۔ ایک ہفتہ دہلی میں قیام کرنے کے بعد وہ
الہ آباد چلا گیا۔ ۳ رجب ۱۱۵۰ھ کو آزاد حج کے لئے روانہ ہوا۔
آٹھ ماہ تک مدینہ منورہ میں اس کا قیام رہا۔ اس وقت اس کی عمر چھتیس سال
تھی۔ حج کرنے کے بعد وہ دکن آیا۔ آزاد کے سفر حج کا انتظام نظام الملک
آصف جاہ نے کیا تھا۔"
لچھمی نرائن شفیق[1] کے مطابق گلشن علی جونپوری کو آزاد بلگرامی سے
غائبانہ خلوص تھا، علماء و فضلاء اور شعراء سے ملاقات کرنے کا آزاد
کو بڑا شوق تھا۔ آفریں لاہوری، شیخ حزیں اور والہ داغستانی سے اس
کی ملاقات تذکروں سے ثابت ہے۔ حاکم لاہوری سے آزاد کی کئی بار

---

[1] گل رعنا۔

ملاقات ہوئی تھی۔ حاکم لاہوری نے اس کے حسن اخلاق کی بڑی تعریف کی
ہے اور اس کے خاندان کو علم و فضل والا خاندان بتایا ہے[1]۔ وہ خود ا[illegible]
فقیر آدمی تھا، لوگوں کو خوش کرنے کی کوشش کرتا تھا اور شعراء سے بڑی
خوش اخلاقی سے ملتا تھا۔ خان آرزو کی ملاقات آزاد بلگرامی سے ہوئی
تھی وہ آزاد سے پہلے سے واقف تھا اور غائبانہ طور پر اس سے محبت
بھی رکھتا تھا۔

آزاد بلگرامی نے عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں اشعار کہے
ہیں اس کے [illegible] شعر ملاحظہ ہو۔

[illegible] آزاد [illegible] شعر [illegible]
مولانا شبلی نعمانی نے لکھا ہے کہ نواب ناصر جنگ شہید ایک روز دربار
میں آیا تو وہاں کئی شعرا موجود تھے۔ [illegible]
موسوی خاں، جرأت اورنگ آبادی، رضوی خان، میرزا جان [illegible]
اور مرزا علی خان [illegible] کا نام قابل ذکر ہے۔ نواب ناصر جنگ شہید نے آزاد
بلگرامی سے اصلاح شدہ اپنی ایک تازہ غزل پڑھنی شروع کی۔
ایک شعر میں نواب موصوف نے سرو کو خراماں باندھا تھا اس پر تمام
شعراء نے اعتراض کیا۔ آزاد نے سند میں مرزا صائب کا یہ شعر
پیش کر دیا تھا۔

یک رہ برآر آستین دست نگارین در چمن
تا دست ہا پنہاں کند سرو خراماں در چمن

---

[1] مردم دیدہ [2] مقالات شبلی۔



اس شعر کو سن کر موسوی خاں، جرأت اورنگ آبادی نے تعجب کا اظہار
کیا تو آزاد بلگرامی نے جواب دیا کہ شاعری کا انحصار تخیل پر ہے۔ سرو کے
درخت ہوا کے چلنے سے جب ہلتے ہیں ایسی حالت میں سرو کو خراماں
کہا جائیگا۔

آزاد بلگرامی نے کبھی کسی کی مدح میں اشعار نہیں لکھے۔ لیکن اس
نے نظام الملک آصف جاہ کی مدح میں ایک رباعی کہی تھی کیونکہ نظام
الملک نے اس کے سفر حج کا انتظام کیا تھا اس لیے اس نے ازراہ تشکر یہ
رباعی لکھی تھی[1]۔

ای حامی دین محیط جود و احسان  حق داد ترا خطاب آصف شایان
او تخت بدرگاہ سلیمان آورد  تو آل نبی را بدر کعبہ رسان

آزاد بلگرامی کی شہرت حدود ہندوستان سے باہر پہنچ چکی تھی۔ ملک
عرب میں بھی اس کی شاعری کی شہرت تھی جیسا کہ خود اس کے ذیل کے شعر سے
پتہ چلتا ہے۔

ز صاحبان سخن کیست ہمچو من آزاد  کہ در بلاد عرب نیز گشتہ ام مشہور

تذکرہ "بے نظیر" کا مصنف عبدالوہاب، آزاد بلگرامی کا شاگرد اور دوست
بھی تھا۔ آزاد بلگرامی کے سال وفات کے متعلق عبدالمقتدر[1] نے لکھا ہے
کہ آزاد کی وفات ۱۱۹۹ھ یا ۱۲۰۰ھ میں ہوئی۔ قدرت[2] اللہ اور مولانا شبلی
نعمانی[3] کا بیان ہے کہ آزاد نے اورنگ آباد میں ۱۲۰۰ھ میں انتقال کیا۔

---

[1] کٹلاگ خدا بخش لائبریری، پٹنہ۔ جلد سوم۔
[2] نتائج الافکار [3] مقالات شبلی۔

## تصنیفات و تالیفات آزاد بلگرامی

۱۔ خزانۂ عامرہ :۔ فارسی شعراء کا یہ تذکرہ ۱۱۷۶ھ میں تالیف ہوا۔

۲۔ مآثر الکرام :۔ اس میں ہندوستان کے علماء اور فقراء کا ذکر ہے۔

۳۔ ید بیضا :۔ شعراء کا ایک تذکرہ ہے

۴۔ سرو آزاد :۔ یہ بھی شعراء کا ایک تذکرہ ہے۔

۵۔ دیوان فارسی

۶۔ دیوان عربی

۷۔ شرح بخاری

۸۔ روضۃ الاولیاء :۔ صوفیوں کا تذکرہ ہے۔

۹۔ سند السعادات فی حسن خاتمۃ السادات :۔ اس میں سیدوں کا ذکر ہے اور ان کی بڑائی بیان کی گئی ہے۔

۱۰۔ سبحۃ المرجان



# ۱۰

# بھگوان داس ہندیؔ

بھگوان داس نے اپنے تذکرہ "سفینۂ ہندی" میں اپنا نام بھگوان داس اور تخلص ہندیؔ لکھا ہے۔ باپ کا نام دنیت داس اور دادا کا نام ہربنس رائے بتایا ہے۔ وہ ذات کے کائستھ تھے اور ان کے آبا و اجداد کا وطن کالپی تھا۔ ان کے والد اور ان کے دادا کے ساتھ نواب برہان الملک سعادت خان نیشاپوری کی صوبہ داری کے زمانے میں اپنے وطن کالپی سے لکھنؤ آئے تھے لیکن موہن لال انیسؔ نے لکھا ہے کہ بھگوان داس کا وطن مکدرہ کا نجر (صوبہ مالوہ) تھا[1]۔

ہندیؔ کی پیدائش سنہ ۱۱۶۴ھ میں ان کے ننھال صید پور میں ہوئی۔ صبی جواں بخت سے ان کی تاریخ ولادت نکلتی ہے جس وقت ان کے والد نے لکھنؤ میں بود و باش اختیار کی اس وقت بھگوان داس کی عمر صرف دو سال تھی۔ جب وہ سن شعور کو پہنچے تو افضل الفضلاء مولوی یوسف سہارنپوری سے فارسی صرف و نحو کی کتابیں پڑھیں۔ اور پھر شعر و شاعری کا آغاز کیا۔ ڈاکٹر علی رضا نقوی کے مطابق انہوں نے مرزا فاخر مکینؔ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا[2]۔ فاخر مکینؔ ہندوستانی فارسی شعراء

---

[1] انیس الاحبا [2] تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاک۔

میں معتبر و مستند اہمیت رکھتے ہیں۔ اس لئے مکینؔ کی شاگردگی ان کے لئے باعث فخر ہے۔

بھگوان داس کا تخلص پہلے بسملؔ تھا بعد میں ہندیؔ تخلص کرنے لگے

؎ درمیانِ سخنورانِ امام — نظم من مخزنِ خردمندی ست

ہندوام، ہندزاد بوم من است — زین دو باعث تخلصم ہندی ست

بھگوان داس ہندیؔ نہ صرف شاعر اور تذکرہ نگار تھے بلکہ نواب آصف الدولہ بہادر کے عہد میں راجہ ندھی سنگھ کی سرپرستی میں "صاحب دستخط" کے منصب پر فائز تھے۔ ہندی نے "سفینۂ ہندی" میں خود لکھا ہے کہ

"پانصد سوار بہ دستخط من ملازم شدند"

راجہ ندھی سنگھ کی موت کے بعد ہندیؔ راجہ بیٹر چند بہادر کے مصاحب و ندیم مقرر ہوئے — یہ امر قابل ستائش ہے کہ نواب آصف الدولہ بہادر کو ہندیؔ پر کامل اعتماد تھا۔ اور امور حکومت میں ان سے مشورے کیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ نواب مذکور نے ہندیؔ کو اپنی فوجوں کا ناظم و نگراں مقرر کر دیا تھا اس کے بعد مہاراجہ تکیت رائے نے ان کو اپنے مصاحب خاص میں داخل کیا ہندیؔ کے بیان سے بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے عہد شباب میں "میر بحر" کے منصب پر فائز اور الہ آباد میں قیام فرما تھے۔ گمان ہے کہ ہندیؔ کو ایک بیٹا بھی تھا۔ لیکن نام معلوم نہیں ہے۔ ثبوت کے لئے ہندیؔ کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔ ؎

ہیچ غم از مرگ خود نبود جز اینم ای پسر

کز پس مرگم غم تو بی پدر خواہد شدن



بھگوان داس ہندیؔ فارسی کے ایک اچھے شاعر اور اپنے زمانے کے نامور تذکرہ نگار تھے۔ ڈاکٹر علی رضا نقوی کے مطابق وہ تاریخ میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے خاندان سے ایک قصیدہ بنام "قصیدہ نامۂ نسب" لکھا تھا۔ لیکن تلاش کے باوجود وہ قصیدہ تادم تحریر راقم حروف کو دستیاب نہ ہو سکا۔ وہ نواب آصف الدولہ بہادر کے دربار سے منسلک تھے۔ نواب مذکور کی مدح میں ان کی درج ذیل رباعی ملتی ہے

ای آنکہ ببوسدت مہ از عجز رکاب — خورشید ز بیم تیغ تو در تب و تاب

دریا ہمہ آب گشتہ از بخشش تو — آوردہ بہانہ درمیان از زر ناب

شیخ علی حزیںؔ اصفہانی اس زمانے میں فارسی زبان کے نامور شاعر تھے۔ تذکروں سے یہ روشن ہے کہ ہندیؔ کو ہمعصر شعراء سے بڑی محبت و عقیدت اور وابستگی تھی۔ وہ ان کی صحبت کو اپنی خوش قسمتی سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ علی حزیںؔ کی صلاحیت و قابلیت سے متاثر ہو کر ہندی نے بنارس کا سفر کیا اور حزیںؔ سے شرف ملاقات حاصل کر کے اپنی محبت و عقیدت کا ثبوت پیش کیا۔

میر شمس الدین فقیرؔ عباسی دہلوی سے بھی ہندی بڑے متاثر تھے۔ انہوں نے فقیرؔ سے لکھنؤ میں ملاقات کی اور ان کی صحبت سے استفادہ کیا۔ "سفینۂ ہندیؔ" میں ہندی نے فقیر دہلوی کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے — "راقم او را دیدہ عجب وارستہ کسی بود۔ مثنویات و دیوان او را دیدہ ام۔ ہمہ کلامش نغز است و سراپا مغز"[1]

---

[1] سفینۂ ہندی۔

ہندی نے رباعیات، غزلیات، ترجیع بند، قصائد اور متفرقات پر مشتمل دو دواوین مرتب کئے تھے۔ جن کے نام علی الترتیب "شوقیہ" اور "ذوقیہ" ہیں۔ لیکن تلاش و جستجو کے باوجود ان دواوین کا تا دم تحریر پتہ نہ چل سکا۔ البتہ ان کا تذکرہ "سفینۂ ہندی" دستیاب ہے جو ان کے حالات زندگی اور نمونۂ کلام سے واقفیت کا بہترین ذریعہ ہے۔ اس تذکرہ میں انہوں نے اپنے حالات زندگی کے ساتھ ساتھ اپنا نمونۂ کلام بھی نقل کیا ہے۔

ان کے اشعار کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ممتاز شاعر تھے، ان کی زبان نہایت سادہ، سلیس، رواں اور برجستہ و بے ساختہ ہے۔ وہ اشعار ملاحظہ ہوں۔ ؎

شب بر امید آنکہ بہ بینم روی تو
آیم در لباس گدای بکوی تو
دلا ہنوز شب وصل اندکی باقیست
چہ شد برای چہ بستی لب التغانہ خویش

ہندی کے کلام میں تخیل کی بلند پروازی اور احساس کی کار فرمائی نے اثر آفرینی پیدا کی ہے انہوں نے اپنے افکار گراں مایہ کے اظہار کے لئے نادر و منفرد انداز سخن اختیار کیا ہے اس معاملہ میں وہ دوسرے شعراء سے کم تر نظر نہیں آتے جیسا کہ ان کے اشعار سے ظاہر ہے ؎

برای آن کہ نیابد کسی نشان مرا
سگان کوی تو خوردند استخوان مرا
بگو بکعبہ روم یا بکوی او ہندی
ز کعبہ یک دو قدم کوی یار نزدیک است



ہندی نے پرانے اور پامال مضامین کو نیا لباس عطا کیا ہے۔ مشہور ہے کہ عشق عاشق و معشوق کو تباہ و برباد کر دیتا ہے اس خیال کو بیشتر شعراء نے اپنے اشعار میں طرح طرح سے پیش کیا ہے۔ اب دیکھئے کہ ہندی نے اس پامال اور پیش پا افتادہ خیال کو اپنے منفرد انداز سے کس طرح لطیف بنا لیا ہے۔

آتش عشق استخوانم سوخت
از سگ یار بس پشیمانیم

جب کوئی کسی پر عاشق ہو جاتا ہے تو وہ اپنا دل اپنے معشوق کو دیدیتا ہے اور اس کا اپنے دل پر کوئی اختیار نہیں رہتا ہے اس خیال کو ہندی نے نئے طرز میں اس طرح پیش کیا ہے۔ ؎

عمر یست کہ ہندی دل ما در بر ما نیست
بی چارہ کجا رفت ندانم بچہ حال است

ہندی کی آرزو ہے کہ جب وہ معشوق کے عشق میں تباہ و برباد ہو گیا حتیٰ اس جہان فانی سے کوچ کر گیا تو معشوق کو چاہیے کہ اس کی قبر کے پاس بیٹھے اور کم از کم مرنے کے بعد ہی سہی اس کی دل جوئی کرے۔ ؎

مکن روزم چو شب تا ریک و بنشیں بر سر خاکم
مہ من، اختر من، مہر من، شمع مزار من

عاشق بڑا مجبور ہوتا ہے معشوق کے جور و ستم سہتے سہتے بالکل ٹوٹ سا جاتا ہے اس کی حالت بے بال و پر کے پرندے کی سی ہو جاتی ہے ذیل کے شعر میں ہندی نے اسی خیال کو پیش کیا ہے۔ ؎

کنم چگونہ تماشای سرو و گل یارب نبود در گلشن نہ بال و پر دارم

ہندؔی کے اشعار عاشقانہ اور پرسوز ہیں۔ ان اشعار کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندؔی نے عشق کا زخم کھایا تھا اس لئے کہ ذاتی تجربہ غم کے بغیر ایسے عاشقانہ اشعار نہیں لکھے جا سکتے۔ چند اشعار بطور نمونہ نقل کئے جاتے ہیں۔ ؎

شب از تپ جدائی جانانہ سوختم — آتش گرفتم از جگر خانہ سوختم
من شمع صفت گریہ کنم شب ہمہ شب — او صبح نمط خندہ زند ہای عجب

بہ بزم یار ز مجنوں فسانہ می خواہد — برای گریہ دل من بہانہ می خواہد
ہندؔی کدام ہوش ربا بردہ از تو دل — زیں سان کہ ترک صبر و دل و ہوش کردہ

ہندؔی کی تصانیف ان کی صلاحیت و کمالات کا ثبوت ہیں۔ وہ معرفت خداوندی میں بھی عقیدہ رکھتے تھے۔ انہوں نے مذہب اسلام کے دقیق مسائل کو "مثنوی مظہرالانوار" اور "رسالہ سوانح النبوۃ" میں بڑے موثر انداز میں قلمبند کیا ہے۔ "سوانح النبوت" میں رسول اکرم حضرت محمدؐ اور بارہ ائمہ کرام کے احوال قلم بند کر کے انہوں نے مذہب اسلام سے اپنی محبت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ گرچہ ہندؔی مشرف با سلام نہیں ہوئے تھے۔ لیکن مذہب اسلام کا انہوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا، مذہبی مسائل سے با خبر تھے اور اسلامی طرز زندگی سے متاثر تھے۔

محبت کیا ہے؟ اس فلسفہ کو ہندؔی نے "مثنوی سلسلۃ المحبت" میں واضح طور پر بیان کیا ہے۔ "مثنوی بھاگونت" بھی ان کی مشہور مثنوی ہے۔

ہندؔی نے فارسی شعراء کے دو تذکرے لکھے ہیں "سفینۂ ہندی" اور "حدیقہ ہندی" تذکرہ [illegible] میں بھی انہیں مہارت حاصل تھی جیسا کہ "سفینۂ ہندی" سے آشکارا ہے۔ "سفینۂ ہندی" کا ایک قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری، پٹنہ



میں موجود ہے۔ اس نسخہ کی کتابت سنہ ۱۲۲۰ھ میں ہوئی۔ اور اس کا کاتب مکھن لال ہے۔ قیاس قوی ہے کہ یہ وہی مکھن لال ہے جو ہندؔی کا شاگرد عزیز تھا اور رائے تخلص کرتا تھا۔ تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندؔی نے سنہ ۱۲۱۹ھ میں اس تذکرہ کی تالیف کی۔ اس وقت ان کی عمر ۵۵ سال تھی۔ ان کی موت کے بعد جو تذکرے لکھے گئے ان میں ان کی تاریخ وفات کا ذکر نہیں ملتا اس لئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ سنہ ۱۲۱۹ھ تک وہ بقید حیات تھے۔

ہندؔی کی تخلیقی ذہانت و عظمت کے ثبوت میں درج ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیں۔ ؎

ای دل ز آستان شہ اولیا مرو — آنجا مقیم باش و دگر ہیچ جا مرو
خواہی کہ مشکلات ہمہ آساں شود بخلق — زنہار از در شہ مشکل کشا مرو

مرو از بہر گل گشت چمن بنگر رخ خود را
گل من سرو من شمشاد من باغ و بہار من
دمی بنشیں مرو مگذار در کنج غم تنہا
کس من ہمدم من مونس من غمگسار من

شبی افسانہ لیلی و مجنوں را بیاں کردم — بایں تقریب احوال دل خود را بخاطرش کردم
فدایت جان من ای قاصدیا — رسانیدی نامہ و جان تازہ کردی
بی خود نبود بسکہ مرا چشم مست او — دستی بہ دل سپردم و دستی بدست او

آں شوخ در آئینہ رخ خود را دید
بر عکس نگاہ چوں فتادش خندید
شد والہ عکس خویش و آئینہ ز ناز
آوردہ بہ پیش روی درویش بوسید

خورشید بہ بیش رخ تو نور ندارد    حسنی کہ تو داری بجز او رندارد
صحرای عشق جملہ زخار الم پراست    این راہ طی نمی شود الا بپای دل
بالم شکستہ از قفس آزاد می کند    صیاد دستگیر فی ستم ایجاد میکند

## ۱۱

# لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی

لچھمی نرائن نام اور شفیق تخلص تھا۔ ذات کا کھتری کپور تھا۔ اس کا دادا بھوانی داس تھا جو اورنگ زیب کی فوجوں کے ساتھ لاہور سے اورنگ آباد شہر میں آکر مقیم ہو گیا تھا۔ بھوانی داس غازی الدین خاں کے ملازمین میں سے تھے۔ شفیق کے والد کا نام منسا رام تھا۔ لیکن منسارام دس سال ہی کا تھا کہ بھوانی داس نے انتقال کیا تھا جسونت رائے نے منسارام کی تربیت اور کفالت اس کے والد کے موت کی بعد کی تھی۔ نواب آصف جاہ نے شفیق کو دکن کے چھ صوبوں کی پیشکاری کا عہدہ دیا تھا اور "گل رعنا" کی تالیف کے وقت بھی وہ اسی عہدے پر فائز تھا۔ "گل رعنا" کو شفیق نے ۱۱۸۱ھ میں تالیف کیا۔ نواب صمصام الدولہ نے اس کو بخشی الممالک دکن کا عہدہ آزاد بلگرامی کی سفارش پر دیا تھا[1]۔

[1] نتائج الافکار۔ ص۔ ۳۹۹ ۔



ڈاکٹر علی رضا نقوی کا بیان ہے کہ ۲ صفر ۱۱۵۸ھ میں شفیق اورنگ آباد میں پیدا ہوا۔ اور آزاد بلگرامی کے سایۂ عاطفت میں اس کی تربیت ہوئی تھی وہ ۱۱۷۵ھ سے ۱۲۱۸ھ تک نواب نظام علی خاں کی ملازمت میں بھی تھا اس کو صمصام الدولہ نے دولت چند کا لقب دیا تھا۔ شفیق کا تخلص پہلے صاحب تھا۔ لیکن آزاد بلگرامی نے ۱۱۸۶ھ میں اس کو شفیق کا تخلص دیا تھا[1]۔ لیکن اردو (ریختہ) اشعار میں اس نے صاحب ہی تخلص رکھا تھا۔

مولف "تذکرہ سخنوران بلند فکر" کا بیان ہے کہ شفیق تاریخ نویسی میں بھی مہارت رکھتا تھا۔ "مآثر آصفی" اور "مآثر حیدری" اسکی تصنیف ہے[2]۔

ڈاکٹر علی رضا نقوی نے لکھا ہے کہ شفیق نے ۱۲۰۱ھ میں انتقال کیا۔ لیکن مزید لکھا ہے کہ یہ تاریخ درست نہیں ہے کیونکہ ۱۲۱۴ھ میں "بساط الغنایم" لکھی تھی۔ "گل رعنا" فصل دوم جو حیدرآباد میں شائع ہوئی ہے اس پر لکھا ہوا ہے "تالیف شفیق متوفی ۱۲۲۳ھ"۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی وفات ۱۲۲۳ھ میں ہوئی لیکن اس تاریخ کی کوئی سند نہیں ملتی۔

فقیر دہلوی اور شفیق اورنگ آبادی کے درمیان اچھے تعلقات تھے۔ ۱۱۸۰ھ میں فقیر دہلوی دوسری بار جب اورنگ آباد گیا تو ہر شام شفیق فقیر دہلوی کی قیام گاہ پر جاتا تھا اور فقیر دہلوی اور آزاد بلگرامی سے ملاقاتیں کرتا تھا۔ فقیر دہلوی کے اورنگ آباد کی آمد پر شفیق نے یہ قطعہ تاریخ کہی تھی

وارد ایں شہر در ذی الحجہ شد
شاعر و دانش ور و روشن ضمیر
سال تاریخ قدوم او شفیق
گفتہ آمد میر شمس الدین فقیر

[1] [2] تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان ص ۳۰۰ ۔

## تصنیفات و تالیفات شفیق

۱۔ حقیقت ہای ہندوستان
۲۔ مآثر حیدری
۳۔ تمیق شگرف
۴۔ مآثر آصفی
۵۔ بساط الغنایم
۶۔ حالات حیدرآباد
۷۔ خلاصۃ الہند
۸۔ شام غریبان
۹۔ چمنستان شعراء
۱۰۔ گل رعنا۔

شفیق شاعر بھی تھا اور اس کے اشعار میں درد اور شیرینی ہے۔ ذیل میں صرف دو شعر نقل کئے جاتے ہیں۔ ؎

گرچہ ای دوست ندیدم چمن روی ترا
دایم از بادصبا می شنوم بوی ترا
شانہ زخمی کن و آشفتہ مکن دلہا را
جمع گشتند دراں زلف پریشانی چند



# ۱۲

# حاجی لطف علی بیگ آذرؔ

لطف علی بیگ نام اور آذرؔ تخلص تھا۔ اس کا تخلص پہلے والہ اور نکہت بھی تھا۔ لیکن ان دونوں تخلص کو چھوڑ کر کے اس نے آذرؔ ہی کو منتخب کیا۔ اس کے باپ کا نام رضا قلی خان ہدایت نے آقا خان لکھا ہے۔ وہ شاملو خاندان سے تھا اور ولی محمد خان مسرور اس کا چچا تھا۔ کچھ دنوں تک اس نے عادل شاہ افشار کے یہاں متوفی اور نویسندہ کے عہدہ پر کام کیا۔ اس نے فن نظم کے اصول و قواعد میر سید علی مشتاق اصفہانی سے سیکھے[۲]۔
رضا قلی خان ہدایت نے لکھا ہے کہ آذر کی پیدائش ۱۱۳۳ھ میں ہوئی۔ عبدالمقتدر[۳] نے اس کا سال ولادت ۱۱۲۴ھ بتایا ہے۔ اپنی پیدائش کے بارے میں خود آذرؔ کا بیان[۴] ہے کہ وہ صبح کے وقت بروز شنبہ ۲۰ ربیع الثانی ۱۱۳۴ھ میں دارالسلطنت اصفہان میں پیدا ہوا جب محمود خان افغان نے اصفہان پر حملہ کیا تو آذرؔ کے خاندان کے تمام لوگ مجبور ہو کر قم ہجرت کر گئے اپنی زندگی کے چودہ سال اس نے قم میں گذارے۔ نادر شاہ کی تخت نشینی کے بعد وہ اپنے والد کے ساتھ شیراز گیا۔ لار اور فارس کے علاقوں میں اس کا باپ اعلیٰ منصب پر فائز تھا۔

---

۱؎ ۲؎ مجمع الفصحاء اول ۳؎ کٹلاگ خدابخش لائبریری جلد سوم ص ۲۱۹ -
۴؎ آتشکدہ ص ۴۴۶ -

پروفیسر براؤن[1] نے لکھا ہے کہ اپنے چچا حاجی محمد بیگ کے ہمراہ حج کرنے بھی گیا تھا فقیر[2] دہلوی کی ملاقات آذر[3] سے ہوئی تھی۔ اس نے اپنے تذکرہ "آتشکدہ" میں فقیر[3] کی تعریف کی ہے اور اس سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ اس کا بیان ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

"میر شمس الدین محمد فاضلی فقیر منش و شاعری نیکو روش......
ملاقات او اتفاق افتاد[3]۔"

رضا قلی خاں[4] ہدایت، پروفیسر براؤن[4]، اور مہدی[5] حسن ناصری متفق ہیں کہ آذر کی موت ۱۱۹۵ھ میں ہوئی۔"

---

۱ A Literary history of Persia vol IV P. 283 ۴ ۲
۳ آتشکدہ ص ۳۹۳ ۴ مجمع الفصحا جلد دوم ص ۱۵۹۔
۵ صنادید عجم ص ۱۷۱۔



# تصنیفاتِ آذر

(۱) تذکرہ آتشکدہ: فارسی تذکروں میں یہ تذکرہ ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ سید مبارز الدین[1] اور عبدالمقتدر[2] متفق ہیں کہ ۱۱۷۴ھ میں یہ تذکرہ پایہ تکمیل کو پہونچا۔ ابن محمود غزنوی سے اس نے اس تذکرہ کی ابتدا کی ہے۔ اور خراسان، کرمان، ہرات، نیشاپور، طبرستان، استرآباد، اصفہان، جرفادقان، مازندران، قم، رے، قزوین، سادہ، کاشان، شیراز، ہمدان، کازرون، توران، خوارزم، بخارا، بدخشان، خجند، سمرقند، ترمذ، ہندوستان وغیرہ کے شاعروں کا ذکر الگ الگ باب میں کیا ہے ہمعصر شعراء کا تذکرہ الگ کیا ہے اور آخر میں اپنا ذکر کیا ہے۔

(۲) یوسف و زلیخا: بمطابق عبدالمقتدر[3] اس مثنوی کو آذر نے ۱۱۷۶ھ میں لکھی۔ ایک بات قابل غور یہ ہے کہ عبدالمقتدر نے آذر کی پیدائش کا سال ۱۱۷۴ھ لکھا ہے۔ دوسری طرف وہ یہ لکھتے ہیں کہ ۱۱۷۶ھ میں آذر نے مثنوی "یوسف و زلیخا" لکھی اس کا مطلب یہ ہوا کہ آذر نے صرف دو سال کی عمر میں مثنوی "یوسف و زلیخا" لکھی جو ناممکن ہے۔ مہدی حسن[4] ناصری کا بیان ہے کہ آذر اچھی غزلیں کہتا تھا اور اس کو اس شاعر سے سخت کدورت تھی۔ جو ایران کو ترک کرکے ہندوستان چلے آئے تھے۔

---

۱ تاریخ ادبیات ایران ص ۵۰۰ ۲ ۳ کیٹلاگ خدا بخش لائبریری پٹنہ جلد سوم ص ۲۲۰۳ ۔ ۴ صنادید عجم ص ۸۶ - ۸۷ ۔

سید مبارز الدین[1] رفعت کا بھی بیان ہے کہ آذرؔ نے متقدمین شعرا کی
طرز کی پیروی کی ۔ اس کے اشعار پاکیزہ اور آب دار ہیں ۔
چند اشعار نمونہ کے طور پر نقل کرتا ہوں ۔

دم آخر شدی دمساز چون من ناتوانی را
مرا گر زنده کردی کشتی از غم جہانی را
قوت پرواز ای صیاد چون سوی چمن نیست
آن قدر نالم که سوی آشیان آرم ترا
بمن که در قفس افتاده ام نمی دانی
چه گونه می گذرد ای ہم آشیان تنہا
گران کردند گوش گل ہمیں آنگاه کہ
به بلبل رخصت فریاد دادم[2]

---

[1] تاریخ ادبیات ایران ۔ ص ۵۰۰ ـ ۵۰۱ ۔
[2] نتائج الافکار ص ۸۶ ـ ۸۷ ۔



# باب ۸

## محمد حسین میر شمس الدین فقیرؔ دہلوی

۱

# برہان الملک سعادت خاں نیشاپوری

بھگوان داس ہندی[1]، قدرت اللہ[2]، اور ڈاکٹر آشیر وادی لال[3] نے سعادت خاں کا نام محمد امین یا میر محمد امین لکھا ہے۔ لیکن وہ برہان الملک کے نام سے مشہور تھا۔ اس کی پیدائش نیشاپور میں ایک سید خاندان میں ہوئی تھی اور اس کا خاندانی سلسلہ حضرت امام موسیٰ کاظم سے جا ملتا ہے۔ اس کی پیدائش کی تاریخ کسی تذکرہ میں نہ مل سکی۔ ڈاکٹر آشیر وادی لال کا بیان ہے کہ ۱۹ر مارچ ۱۷۳۹ء ر ۱۱۵۱ھ میں انتقال کیا۔ اس کے والد کا نام میر محمد نصیر تھا۔ اس کے والد ترک وطن کر کے ہندوستان چلے آئے تھے۔ اور کچھ دن پٹنہ میں بھی قیام کیا تھا۔ تاریخ عماد السعادات میں مذکور ہے کہ سعادت خان تلاش معاش میں اپنے بھائی کے ساتھ ہندوستان آیا تھا اور سربلند خاں نے دونوں بھائیوں کو ملازمت دی تھی۔ ڈاکٹر آشیر وادی لال کا بیان ہے کہ فرخ سیر نے سعادت خاں کو ہزاری منصب دیا تھا۔ محمد شاہ نے اس کو فوجدار ہنڈون اور بیانہ کے عہدہ پر فائز کیا تھا۔ اور محمد شاہ ہی نے اس کو سعادت خان بہادر کا خطاب دیا تھا بعد میں وہ آگرہ کا گورنر بھی

---

[1] سفینۂ ہندی ص ۳۳ [2] نتائج الافکار ص ۵۸ بحگہ
[3]
[4] کاتب نے غلطی سے سعادت خاں لکھدیا ہے اس عہد میں سعادت خاں نام کا کوئی نواب اور خان بہادر نہیں تھا۔



ہوا۔ اور ۱۷۲۲ء میں اودھ کی صوبہ داری اس کو ملی۔ اس نے صوبہ داری کے کام کو نہایت بہتر طور پر انجام دیا۔ اس میں ایک مشہور سپہ سالار کی ساری خوبیاں تھیں۔

والہ داغستانی[1] کا بیان ہے کہ اس کی طبیعت موزوں تھی اور امین تخلص کرتا تھا اس نے اس کا ذیل کا شعر نقل کیا ہے ؎

ز کلام رہ بیابم کہ بچشم تو درآیم ؎ کہ بدور چشم مستت ہمہ نیزۂ سیاہت

کرنال کے میدان میں ۱۱۵۱ھ میں سعادت خان موجود تھا۔ نادر شاہ اور محمد شاہ کی فوجیں برسرپیکار تھیں۔ سعادت خاں اور نظام الملک محمد شاہ کی طرف سے جنگ کا انتظام کر رہے تھے۔ آخر دو کروڑ روپئے پر نادر شاہ سے صلح ہو گئی۔ لیکن نادر شاہ کا پھر خیال بدل گیا اور وہ شہر دہلی آیا اور شہر پر اس کا قبضہ ہو گیا بہت قتل و غارت کے بعد نادر شاہ اپنے وطن کو واپس چلا گیا۔ ڈاکٹر آشیر وادی لال نے لکھا ہے کہ سعادت خاں نے زہر کھا کر انتقال کیا۔

DOW[2] کا بھی یہی بیان ہے۔ لیکن غلام حسین[3] نے لکھا ہے کہ سعادت خاں کے پاؤں میں سرطان ہو گیا تھا اور اسی مرض میں اس نے وفات پائی۔

فقیر دہلوی نے جاہ و مال کے خیال سے کسی کی مدح نہیں کی۔ اسی لئے اس نے کسی کی مدح میں ایک قصیدہ بھی نہیں لکھا۔ لیکن سعادت خاں نیشاپوری سے اس کے تعلقات بہت استوار تھے۔ اس لئے اس نے ایک طویل مثنوی ایک سو گیارہ اشعار پر مشتمل اس کے محل کی تعریف میں لکھی۔ اور جا بجا اس کے اوصاف حمیدہ کی بھی تعریف کی ہے۔ اس مثنوی کا آغاز ذیل کے شعر

---

[1] ریاض الشعراء ورق ۲۸۔ [2] The History of Hindustan.. p. 345.
[3] سیرۃ المتاخرین دوم ص ۴۸۵

سے ہوا ہے۔ ؎

دگر بر روی طبع نکتہ پرداز  ددی گر دیدہ از فیض سخن باز

اور اختتام ذیل کے شعر پر ہوا ہے۔ ؎

جہاں را خانہ بر پای باشد  در و نواب بزم آرائی باشد

فقیرؔ دہلوی نے سعادت خاں کی تعریف ذیل کے اشعار میں کی ہے۔ ؎

امیری کز کمال شوکت و جاہ  زدہ بخت بلندش خیمہ بر ماہ

سیادت جو ہر آئینہ او  محبت خانہ زاد سینہ او

ازاں ثابت قدم در راہ دین است  کہ فرزند امیر المومنین است

نمودہ مال خود را وقف سادات  زبانش مدعا کسب سعادات

سعادت خاں جب ایک بار بیمار رہا تو غسل صحت کے موقع پر فقیرؔ نے بارہ اشعار پر مشتمل ایک قطعہ لکھا تھا اس کے دو اشعار ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں۔ ؎

گشتند ز غسل صحت تو  دلہا ز غبار کلفت آزاد

تاریخ شفا چنین رقم زد  آزار نصیب دشمنت باد

فقیرؔ دہلوی نے سعادت خاں کے میر بخشی ہونے کے موقع پر بھی ایک قطعۂ تاریخ کہی تھی اس میں کل ۱۵ اشعار ہیں۔ دو شعر ملاحظہ ہو۔ ؎

چوں بحکم شہ جہان او را  میر بخشی گری مقرر شد

سر بد خواہ را برید انگاہ  گفت نواب میر لشکر شد

---



# ۲

# علی قلی خان والہؔ داغستانی

علی قلی نام اور والہؔ تخلص تھا۔ اس کے والد کا نام محمد علی خان تھا ۱۱۲۴ھ میں وہ اصفہان میں پیدا ہوا ۱۱۴۶ھ میں ترک وطن کرکے وہ ہندوستان آیا۔ ۱۱۴۷ھ میں دہلی پہنچا اور محمد شاہ نے چار ہزاری، احمد شاہ نے پانچ ہزاری اور عالمگیر ثانی نے سات ہزاری منصب بخشا تھا۔ ۱۱۶۹ھ میں اس کی وفات دہلی میں ہوئی۔ اس کی زندگی کے تفصیلی حالات معاصرین کے باب میں لکھے گئے ہیں۔ اس لئے یہاں پر مزید تحریر کی ضرورت نہیں ہے۔

والہؔ داغستانی اور فقیرؔ دہلوی کے درمیان دوستانہ تعلقات تھے۔ اس لئے والہؔ داغستانی کے داستان عشق کو فقیرؔ دہلوی نے مثنوی "والہ و سلطان" میں تفصیلی طور پر قلم بند کیا ہے۔ والہؔ داغستانی کی شادی کے موقع پر بھی فقیرؔ دہلوی نے دو قطعہ تاریخ کہی تھی۔ ذیل میں ایک قطعہ تاریخ نقل کی جاتی ہے۔ ؎

زیں جشن عروسی سرا پا امید
از عیش ابد بگوش جان دادہ نوید
کردم چو بیان سال تاریخش را
دل گفت وصال مشتری با ناہید

۱۱۵۰ھ

اپنی مثنوی " والہ و سلطان " میں فقیرؔ دہلوی نے والہ داغستانی کی تعریف اس طرح کی ہے ۔ ؎

ای والہ حسن دل کشت جان
عشق تو بہردہ کون سلطان
آفاق ظہور حسن و عشقت
شیریں و شور حسن و عشقت
از حسن تو دیدہا گلستان
وز عشق تو سینہا چراغان
بر چہرۂ حسن رنگ از تو
بر شیشۂ عشق سنگ از تو



## ۳

# قزلباش خان امیدؔ

قزلباش خان کا نام محمد رضا اور وطن ہمدان تھا۔[1] اس کی پیدائش ہمدان میں ہوئی تھی۔ مگر خوشگو نے اصفہان لکھا ہے۔ اس کی زندگی کے تفصیلی حالات معاصرین کے سلسلے میں لکھے گئے ہیں اس لئے یہاں پر اس کی گنجائش نہیں ہے ۔

فقیرؔ دہلوی نے امیدؔ کی مدح میں بھی کوئی قصیدہ نہیں لکھا۔ لیکن چونکہ سفر دکن میں اس کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا اور دونوں کے درمیان دوستانہ تعلقات تھے۔ اس لئے فقیرؔ نے ایک قطعہ میں قزلباش خان کی تعریف کی ہے لیکن اس کا بھی موقع نہیں آتا۔ اگر فقیرؔ دہلوی کو دکن میں قرآن مجید کی ضرورت پیش نہ ہوتی ۔ اتفاق سے سفر دکن میں فقیرؔ دہلوی اپنے ساتھ کلام پاک لے جانا بھول گیا۔ یا ممکن ہے کہ راستہ میں کسی جگہ وہ سامان کے ساتھ چھوٹ گیا۔ بہر حال وجہ جو بھی ہو لیکن فقیرؔ دہلوی کو کلام پاک کی شدید ضرورت تھی اس لئے اس نے قزلباش خان کو ایک رقعہ لکھ کر اس سے کلام پاک طلب کیا ۔ ذیل میں اس قطعہ کے چند اشعار لکھے جاتے ہیں جس سے قزلباش خان کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے

---

[1] ریاض الشعراء ، نتائج الافکار ، سفینۂ ہندی ، تذکرہ بے نظیر ۔

ے

ای شه ملک فصاحت کردم عرض سخن — پیش کلک تو بود لال زبان سحبان
توی امروز سلیمان سریر معنی — از سخن هست ترا خیل پری در فرمان
پایه همت تو چون سخن تست بلند — همچو نظمت کرم وجود تو مشهور جهان
قطره آبیست گهر پیش سخا و کرمت — سایه دست تو کم نیست زبر نیسان

---

قزلباش خان امید کی وفات پر فقیر دہلوی کو نہایت افسوس ہوا۔ اس لئے اس نے تین قطعہ تاریخ لکھی۔
ذیل میں دو شعر پر اکتفا کیا جاتا ہے ۔ ے

واحسرتا دریغا کز جور پیشۂ مرگ
از پا فتاد ناگہ سرور دان امید
جستم فقیر از عقل تاریخ این مصیبت
گفتا کہ گشت بی آبی باغ جان امید

●



# باب ۹

## شاگردان میر شمس الدین فقیر دہلوی

# عماد الملک غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ

میر شہاب الدین نام اور عماد الملک غازی الدین خان خطاب تھا جو احمد شاہ کی طرف سے صفدر جنگ کی سفارش سے اسے ملا تھا اس کا باپ میر محمد امیر الامراء فیروز جنگ غازی الدین خاں بہادر کے خطاب سے شہرت رکھتا تھا۔ محمد بخش[1] کو کلتاش آشوب کے مطابق اس کی پیدائش ۱۱۴۹ھ میں ہوئی۔ باپ کے مرنے کے بعد اس نے صفدر جنگ وزیر کی خوشامد کی۔ اس نے احمد شاہ سے اسے امیر الامراء کا عہدہ دلوایا۔ ولیم بیل کا بھی بیان ہے کہ عماد الملک آصف جاہ کا پوتا تھا۔ اور اسے صفدر جنگ کی سفارش سے احمد شاہ نے امیر الامراء کا عہدہ اور عماد الملک غازی الدین خاں کا خطاب بخشا تھا[2]۔

عبد القادر خان[3] نے "تاریخ عماد الملک" میں عماد الملک کی بڑی تعریف کی ہے اس کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ چار سال کی عمر میں اس نے پڑھنا شروع کیا۔ میر شمس الدین فقیر اس کا اتالیق مقرر ہوا۔ تیرہ سال کی عمر میں اس نے تحصیل علوم سے فراغت حاصل کر لی۔

مصطفیٰ خان شیفتہ[4] نے عماد الملک کی بڑی تعریف کی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ عماد الملک نے کئی زبان میں شاعری کی ہے۔ اور وہ نظام تخلص کرتا تھا۔

---

[1] تاریخ محمد شاہی صفحہ ۵۲۔ [2] Oriental Biographical Dictionary p. 143.
[3] تاریخ عماد الملک صفحہ ۶-۸، [4] گلشن بے خار مطبوعہ صفحہ ۲۲۱۔



غلام محمد ہفت[1] قلمی کے بیان کے مطابق عماد الملک عربی اور فارسی میں مہارت رکھتا تھا "تذکرہ شعر فارسی و سلاطین[2] و امراء" نے عماد الملک کو صاحب دیوان بتایا ہے۔ اور علی احمد[3] ہاشمی نے اسے شاعری میں میر شمس الدین فقیر کا شاگرد بتایا ہے عماد الملک کے سال وفات میں اختلاف پایا جاتا ہے "تذکرہ شعر فارسی[4] و سلاطین و امراء" میں سال وفات ۱۱۸۹ھ مرقوم ہے۔ علی احمد خان[5] ہاشمی کے مطابق اس کی موت کالپی میں ۱۲۱۵ھ میں ۶۷ سال کی عمر میں ہوئی۔ تاریخ فرخ آباد[6] سے پتہ چلتا ہے کہ عماد الملک کا انتقال ۱۲۱۵ھ میں کالپی میں ہوا۔ اور حضرت شیخ فرید الدین شکر گنج کی درگاہ پاک پٹن میں دفن کیا گیا۔ کیونکہ یہ اس کی وصیت تھی عماد الملک کے دیوان کا جو نسخہ برٹش میوزیم[7] لندن میں ہے اس کی ابتداء اس شعر سے ہوئی ہے

بسم اللہ المھیمن ذی الفضل و العطا
مستلزم العبادۃ مستوجب الثنا

---

[1] تذکرہ خوش نویسان مطبوعہ ۷۶ [2] [3] شعر فارسی و سلاطین و امراء ص ۴۹ [4] [5] مخزن الغرائب جلد دوم ص ۹۴۲ - [6] تاریخ فرخ آباد ص ۹۳ [7] کیٹلاگ برٹش میوزیم جلد دوم۔

# ۲

# شیخ گلشن علی جونپوری

گلشن کی زندگی کے حالات تذکروں میں بہت کم ملتے ہیں۔ اپنے حالات سے متعلق جو خط اس نے میر غلام حیدر کو لکھا تھا وہ خط "گل رعنا" میں مرقوم ہے۔[1] اس خط سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس کے آبا و اجداد سات آٹھ پشت سے جونپور میں سکونت پذیر تھے۔ وہ انصاری الاصل تھا اور اس کی ولادت ۱۱۱۷ھ میں ہوئی۔ اپنے والد شیخ عطاء اللہ انصاری سے فارسی اور میر محمد عسکری جیسے مشہور عالم سے عربی کی تعلیم حاصل کی۔ تلاش معاش میں اسے کچھ عرصہ تک اپنے وطن کے اطراف میں چکر بھی کاٹنا پڑا۔ ۱۱۴۲ھ میں وہ دہلی آیا اور میر محمد افضل ثابت کی خدمت میں ایک مدت تک رہا۔ شعر و شاعری کا شوق تھا۔ میر محمد افضل ثابت سے اصلاح لی۔ جب ثابت کا انتقال ہوا تو میر شمس الدین فقیر کی شاگردی اختیار کر لی۔ چوبیس سال کا عرصہ اس نے نواب شیر افگن خاں باسطی کی خدمت میں گذارا۔ خطاطی میں اس نے شیخ علی حزیں سے اصلاح لی اور حزیں کے دیوان کی اس نے دو مرتبہ کتابت کی، خط نستعلیق، شکستہ اور ثلث میں وہ بڑا مشاق تھا۔ خدا بخش لائبریری، پٹنہ میں اس کا ہاتھ کا لکھا ہوا تذکرہ "ریاض الشعراء" خط شکستہ کا بہترین نمونہ موجود ہے۔

---

[1] گل رعنا ورق ۲۱۲۔



قدرت اللہ[1] کا بیان ہے کہ گلشن کے اجداد نے عرب سے آکر جونپور میں سکونت اختیار کی تھی۔ گلشن کی ایک مثنوی "صورت حال" ہے، اس مثنوی کے حوالے سے Rieu[2] نے لکھا ہے کہ گلشن سب سے پہلے بند علی خاں کا معتمد یعنی سکریٹری مقرر ہوا۔ پھر شیر افکار خاں کی ملازمت میں تھا۔ اس نے نادر شاہ کے قتل عام کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں اس نے جونپور کے قصبہ ماہل میں گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

گلشن صاحب دیوان تھا۔ اس کے دیوان کا ایک نسخہ جو ۸۱ اوراق پر مشتمل ہے برٹش میوزیم لندن[3] میں ہے۔ اس نسخہ کی ابتدا اس شعر سے ہوئی ہے۔

ای رقم کردہ ہمچو نقش نگیں ⁂ صورت حال ما بلوح جبیں

گلشن، والہ داغستانی کی ملازمت میں بھی رہا۔ اس نے والہ داغستانی کی موت پر ایک پردرد مرثیہ بھی کہا ہے۔

تذکرہ "روز روشن[4]" کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے اشعار کی تعداد تقریباً پانچ ہزار ہے۔ گلشن کے چند اشعار نمونہ کے طور پر ذیل میں درج کیے جاتے ہیں

نمی دانم شب دوری بپایاں کی رسد گلشن ⁂ مگر صبح قیامت نیست در پی شام ہجراں را

در غم ہجرت بگردوں می رسانم آہ را ⁂ می زنم تیر ہوائی بد جگر بد خواہ را

ببوسم پای قاصد را کہ از کوی تو می آید

نثار نامہ سازم جان کز دیوی تو می آید

---

[1] نتائج الافکار ص ۶۰۸ [2] [3] کٹلاگ برٹش میوزیم جلد دوم ص ۷۱۵

[4] روز روشن ص ۶۹۱۔

# ۳

# میر قمر الدین منتؔ

بھگوان داس ہندی، قدرت اللہ[1] اور مظفر حسین صبا[2] نے میر قمر الدین نام اور منتؔ تخلص لکھا ہے۔ تذکروں سے یہ بات معلوم ہوئی کہ وہ سید ناصر الدین کے سلسلہ سے تعلق رکھتا ہے جس کا مزار قصبہ سونی پت[3] میں ہے۔ منتؔ کی پیدائش قصبہ سونی پت میں ہوئی اور نشو و نما دہلی میں۔ اس نے حدیث و تفسیر شاہ عبد العزیز دہلوی سے پڑھی اور مولانا فخر الدین دہلوی کے مریدوں میں سے تھا۔ شاعری میں اس نے میر شمس الدین فقیرؔ سے اصلاح لی تھی[2]۔

تصوف سے اچھی طرح بہرہ ور تھا اور ۱۱۹۱ھ میں شہر دہلی سے لکھنؤ گیا۔ لکھنؤ کے قیام میں اس نے نواب آصف الدولہ، حیدر بیگ خاں نائب ریاست اور راجہ ٹکیت رائے دیوان کی مدح میں قصیدے لکھے اور کافی انعام پایا۔ اس کے بعد وہ بنگال گیا اور نواب مرشد آباد کی مدح میں قصیدہ لکھا۔ نواب مرشد آباد نے خلعات سے نوازا اس کے بعد کلکتہ میں اس نے گورنر جنرل کی مدح میں قصیدہ لکھا اور ملک الشعراء کا خطاب پایا۔ بعدہٗ وہ حیدر آباد گیا اور نواب نظام علی خاں بہادر نے اس کو دس ہزار روپیہ بطور صلہ دیا۔ حیدر آباد سے پھر وہ لکھنؤ گیا ۱۲۰۸ھ میں پھر وہ کلکتہ پہنچا۔ جہاں اس نے انچاس سال کی عمر میں وفات پائی اور کلکتہ ہی کے کربلا میں

[1] نتائج الافکار ص ۴۸۸ [2] روز روشن ص ۷۴۸ [3] کیٹلاگ خدا بخش جلد سوم ص ۳۴۲ —



مدفون ہوا۔ ذیل میں اس کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔ ؎

بس از مردن بجا کم آمدی از مہربانیہا — بقربان سرایں مرگ باد از زندگانیہا

جبیں داری بکوئت نیست جا تا رفتم آنجا — ز دل خالی زمینی نیست تا پہلو نہم آنجا

من آن آتش نوا مرغم کہ از تاب نفس منتؔ — بجوب گل زنم آتش بسوزم خانہ خود را

بوسہ منتؔ چہ بلا شیریں بود — کہ گلو تا بجگر سوخت مرا

# ۴

# میرزا ابو علی ہاتف اصفہانی

بھگوان[1] داس ہندی اور قدرت اللہ[2] کا بیان ہے کہ ہاتفؔ کا نام ابو علی تھا اور وہ میرزا اسماعیل ایما کا نواسہ تھا۔ اپنے والد کے ساتھ صغر سنی میں اصفہان سے دہلی آیا۔ ہاتفؔ کو سن تمیز ہی میں شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ اس نے میر شمس الدین فقیرؔ کی خدمت میں مشق سخن کی۔ اور ہندیؔ کا خیال ہے فقیرؔ ہی نے اس کو ہاتف تخلص بخشا تھا۔ ایک مدت تک وہ نواب صفدر جنگ کے ساتھ رہا اور جب نواب صفدر جنگ اودھ کا صوبہ دار ہوا تو وہ دہلی سے لکھنؤ آیا۔ اس کے بعد نواب شجاع الدولہ کی خدمت میں زندگی بسر کی۔ شجاع الدولہ کی وفات کے بعد نواب آصف الدولہ کی ملازمت میں رہا۔ بھگوان داس ہندیؔ سے اس کی ملاقات بار بار ہوئی۔ اس کا خیال ہے کہ ہاتفؔ شعر و سخن میں اچھا سلیقہ رکھتا تھا۔

[1] سفینۂ ہندی ص ۲۴۱، ۲۴۰ [2] نتائج الافکار ص ۸۷ - ۷۸۶ -

قدرت اللہ نے لکھا ہے کہ ہاتف نے پہلے میر افضل ثابت سے اصلاح لی تھی اس کے بعد میر شمس الدین فقیر سے اصلاح لی تھی۔ اسی[1] سال کی عمر میں سنہ ۱۲۰۰ھ کے آخر میں ہاتف نے وفات پائی[2]۔ ذیل میں ہاتف کے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں ۔

بدور خط بتان منعم از فغاں مکنید ۔۔۔ دریں بہار مذکف رفتہ اختیار مرا

ہمچو نقش قدم زمیں گیر یم ۔۔۔ خاک بر فرق ناتوانی من

شب بیاد آن گل رخسار اشکی ریختم ۔۔۔ می دمد بوی گلاب از جیب دامانم ہنوز

رباعی

دردا کہ زد ہر با نہیزان رفتند ۔۔۔ زیں بزم بجو شمع اشک ریزان رفتند

ما یوسف دل را بیکہ خواہیم فروخت ۔۔۔ اکنوں کہ ازیں مصر عزیزان رفتند

●

# ۵

## طالبِ علی عاشق

عاشق[1] کی پیدائش اور نشو و نما حیدرآباد[2] میں ہوئی اور اس کے آبا و اجداد بھی حیدرآباد سے تعلق رکھتے تھے لیکن ایک مدت تک دہلی میں اقامت پذیر رہا۔ عاشق نے بھگوان داس ہندی کے بیان کے مطابق اوائل میں علی عظیم خلف میر ناصر علی سے اصلاح سخن لی ۔ اس کے بعد اس نے میر شمس الدین فقیر کے خدمت میں حاضر

---

[1] نتائج الافکار ص ۸۷ - ۸۶ [2] آقا محمد اصفہانی ، میر قاسم خان اکبرآبادی ، علی اکبر خان لکھنوی ، مولوی عباس علی ، موہن لال وغیرہ کا تخلص بھی عاشق تھا ( نتائج الافکار - روز روشن )
[3] سفینۂ ہندی ص ۱۴۳



ہو کر اصلاح لی ، فن عروض اور قافیہ سے وہ واقف تھا ۔ مہر بنانے کے کام میں اس کو بڑی مہارت تھی ۔ لیکن چونکہ مزاج میں استغنا تھا اس لئے اس کی طرف مائل نہیں ہوتا تھا ۔ ہندی نے اس کا صرف ایک شعر نقل کیا ہے ؎

دیدم آشفتہ زلف تو غریبانی چند
خانہ بر دوش و سیہ بخت و پریشانی چند

●

# ۶

## میرزا پھو ذرہ[1]

ذرہ کے حالات زندگی بہت کم ملتے ہیں ۔ اس دور کے نامور تذکروں میں اس کا ذکر نہیں ملتا ۔ صاحب " نتائج الافکار " اور " روز روشن " نے بھی اس کو فراموش کیا ۔ بھگوان داس ہندی نے اس کا نام محمد سمیع اور اس کے والد کا نام محمد شفیع اکبرآبادی لکھا ہے ۔ اس کے والد اودھ کے نواب شجاع الدولہ کے دربار میں کسی عہدہ پر عزت اور وقار کی زندگی بسر کرتے تھے ۔

ذرہ کی پیدائش لکھنؤ میں ہوئی تھی ۔ علم طب میں بھی اس کو مہارت کلی تھی اس نے علوم رسمی کی تعلیم اس زمانہ کے استادوں سے حاصل کی ۔ بھگوان داس ہندی کا بیان ہے کہ شعر و سخن میں اس نے میر شمس الدین فقیر سے اصلاح لی تھی ۔ اس کے اشعار اچھے تھے اور اس کے دیوان میں تقریباً دو تین ہزار بیت ہوں گے

---

[1] میر عبداللہ پسر محمد باقر مجلسی کا تخلص بھی ذرہ تھا ( سفینۂ ہندی ص ۷۹ ) سید افتخار علی بن خورشید علی بلگرامی کا تخلص بھی ذرہ تھا ( روز روشن ص ۲۴۲ )

ہندیؔ نے لکھا ہے کہ نواب شجاع الدولہ کی وفات کے بعد اپنے متعلقوں کے ساتھ وہ زیارت کے لیے کربلائے معلیٰ چلا گیا اور وہیں اس کی وفات ہوئی۔ ہندیؔ نے اس کا ایک شعر اور ایک رباعی نقل کی ہے جسے راقم حروف ذیل میں پیش کرتا ہے۔ ؎

بیہودہ چہ می رنجی از نالہ زار من!
ناصح تو سر خود گیر من دانم و کار من

---

رباعی

سرما بگذشت و این دل زار ہمان
گرما بگذشت و این دل زار ہمان
القصہ تمام گرم و سرد عالم
برما بگذشت و این دل زار ہمان



# باب ۱۰

## گل چینی از دیوان فقیرؔ دہلوی

شعر فقیرؔ را کہ بلذت چو شکر است
حرفِ دہانِ یار فزوں تر کند لذیذ
(فقیرؔ دہلوی)

ای در طلب نام تو آوارہ نشانہا   گم کردہ رہ معنی وصف تو بیانہا
ہرچند کہ در مرتبہ برتر ز مکانی   غیر از تو نبود است مکینی بمکانہا
گنجیدہ از لطف میان دل آگاہ   وین طرفہ کہ دایم شکناری ز میانہا
خالی است ز نقد دل و جان کیسۂ عشاق   در غارت سودای تو رفتہ است دوکانہا
بیغانۂ داغ تو بدلہا نزد آتش   آری بقوام آمد از و شیرۂ جانہا
بی وصف تو گویا نشود ہیچ زبانی   با آنکہ در اوصاف تو لالند زبانہا

صاحب نظران از تو بغیر از تو نخواہند
یارب کہ فقیر تو بود سیر از انہا

✲

شد آن نیرنگ در رنگ جمال دلبران پیدا   چو مضمونیکہ لطفش کرد از حسن بیان پیدا
خریداراند میگیرم سر راہ گلعذاران را   طمع دارم کہ گردد یوسفی زین کاروان پیدا
غبار دستیم چون ابر حائل بود آن مہ را   کنار از خود گرفتم تا شود دیدار از میان پیدا
چنان در عضو عضو من سرایت کرد بیدادش   کہ پیکانش برنگ مغز ہر است از استخوان پیدا
ہدف کرد است آن شوخ ستم کش استخوانم را   باین گمنامی از من ہست در کویش نشان پیدا
غرور و عجز و حسن و عشق تا باہم مقابل شد   درین حدت سرا گردید صد صد آستان پیدا

ز آمد آمد قاصد فقیر از خویشتن رفتم
چہ خواہم کرد اگر دلدار گردد ناگہان پیدا



برای نازنینی میکشم ناز جہانی را   ببوی یوسفی گیرم سر رہ کاروانی را
دلی ما تیر بیدردان بود ظالم نشانش کردی   درین تاریک شب گشتی چراغ دودمانی را
مگر آن مہ بحال بیدردان با خبر گردد   دو چارش کن خدایا ہم چو او نامہربانی را
بہر کس حال دل را گفتہ ام باور نمود اما   نمیگردد یقین ہر کرد خاطر بدگمانی را
بمشق موشگافی چشم شوخ آن کمان ابرو   نشان تیر خود کرد است چون من ناتوانی را
گلستان را چنان غارتگر ناز تو برہم زد   کہ ہر شاخ گلی ہرجا ندیدم آشیانی را
غرور دلبران با خاک یکسان شد بجز رافت   زمین کردی قیامت پارۂ من آسمانی را
اگر آن غنچہ لب را گوش بر فریاد من باشد   چو بلبل ہر نفس انشا نمایم داستانی را

فقیر خاکسارم را نمیدانم چہ شد لیکن
بکوی ظالمی افتادہ دیدم استخوانی را

✲

عالم ہمہ در سودی ناب است دل ما   قشر است جہان لب لباب است دل ما
کاہی نشد از روی تو شرمندہ عکسی   حیرت کش آئینہ و آب است دل ما
خونابہ گر از دیدہ فشانیم عجب نیست   از گرمی خوی تو کباب است دل ما
تاراج خزان نیست ندارد بصنوبر   پیریم و ہمان مست و شباب است دل ما
تو باز چہ آرد بسر خرمن طاقت   در راہ طلب برق شتاب است دل ما
چون آئینہ از جلوات تو آگاہ نگشتیم   از حسرت دیدار تو خراب است دل ما
تا کی بعبث اندر آئینہ در آئی   ای رشک پری بہر حجاب است دل ما

دایم بکف جود غنی چشم فقیر است
حق بحر محیط است و حباب است دل ما

✲

راحت خیال میکنم آزار خویش را　　دارم از آن عزیز دل آزار خویش را
جای نمیشود نمکین دلبری دوچار　　یاران کجا برم دل افکار خویش را
گویند کارسازی عاشق کند وصال　　من در فراق ساخته ام کار خویش را
خوبان که می خرند جهانی بیک نگاه　　کی می کشند ناز خریدار خویش را
قید تو خوشترست ز آزادی دو کون　　ظالم رها مساز گرفتار خویش را
میداشت گر ز چشم من آئینه پیش رو　　میدید جلوهٔ گل رخسار خویش را

در دور من که قحط سخن عام شد فقیر
بشناس قدر کلک گهربار خویش را

✲

شود هر سبزه از مشک خطش ... تنگ در صحرا　　برد از شرم رویش لاله بار رنگ در صحرا
بدل زان یار لیلی وش هزاران کوه غم دارم　　کجا مجنون تواند شد بمن همسنگ در صحرا
ز آهستگی که دارد تا بام در شهر بند آتش　　جنونم میبرد اکنون باین آهنگ در صحرا
فقیه شهر اگر حرفی ز لوح عشق برخواند　　دهد بر باد خیر دانش و فرهنگ در صحرا
تواند خضر راه وادی مجنون شدن زندی　　که در اول قدم گم کرد نام و ننگ در صحرا
گرفتار ترا از شهر صحرا هیچ نگشاید　　بدم دیگر از شهر و شوم دلتنگ در صحرا
تلقی منظوم از گلباد گریه چشم بگشایم　　فریبد نوبهارم گر بصد نیرنگ در صحرا
بیاد آدم خط سبزی بهر جا سبزه بینم　　برد دیوانه ام با خود خیال ننگ در صحرا
غنی طبعان طرف کردند با فکر ز بر دستم　　اگر مد بزند بر شیر روبهی جنگ در صحرا

فقیر از همتم را سر بسلطانی فرود آید
شود هر گل زمینی بهر من اورنگ در صحرا

✲



دیده ام از روی آفتابی که می سوزد مرا　　کرده ام گلگشت مهتابی که می سوزد مرا
با که گویم غیر را امشب چراغ محفل است　　جلوه مهر جهانتابی که می سوزد مرا
چند با غیر آتشین رخسار من بزم شراب　　جمع آورد آتش و آبی که می سوزد مرا
وقف خلق غیر می سازد زلال زندگی　　تیغ او دارد دم آبی که می سوزد مرا
نرگس او جادوئی پوشید از من با رقیب　　صد اشارت دارد ابرابی که می سوزد مرا
ز آتشی کاندر دل من شعله یعنی بر فروخت　　می چکد از دیده خونابی که می سوزد مرا
بوسه زان لب گرفتم آتشم در دل فتاد　　خوردم از جامش می نابی که می سوزد مرا
اضطراب دل درون سینه آتش نو بمن　　دارم اندر بوته سیمابی که می سوزد مرا

آه آتشبار را افسانه پندارد فقیر
نرگسش دارد شکرخوابی که می سوزد مرا

✲

ره عشق است ای دل چند باشی ناامید اینجا　　که دارد در بغل چون غنچه هر قفلی کلید اینجا
شود چون عشق کامل خاکساری بار می آرد　　بخاک افتاد مانند ثمر هر کس رسید اینجا
قلم میخواست بنویسد حدیثی از سر پایش　　چو آمد در میان حرف قدش آهی کشید اینجا
بنازم عالم یکرنگی معشوق و عاشق را　　تو در گلشن خرامیدی و دل در خون طپید اینجا

فقیر آن بی مروت می کشد ما را باستغنا
نگیرد تیغ قاتل زنگ از خون شهید اینجا

✲

... میکند در کار من لطف نهانی را　　جنونم خوب می فهمد زبان بی زبانی را
بجود بالیدن آن سبزه خط نیست بیوجهی　　که مشتاقان باو دادند آب زندگانی را
خمار حسرت قسمت ما می شود ساقی　　بجام هر که میریزی شراب مهربانی را

گر از ذوق دم تیغش خضر را آگهی باشد    بیکدم می کند تسلیم عمر جاودانی را
فقیر از مهر خوبان شیخ هم مانع نشد ما را
بلی هر کس که باشد دوست دارد زندگانی را

※

شانه ی که کشای ز سر زلف شکن را    از یاد غریبان ببری صبح وطن را
در خاک هم از من نرود سوز محبت    خورشید بود داغ دلم صبح کفن را
از پهلوی دل شهرت ما گشته جهانگیر    نام آوری از فیض عقیق است یمن را
منکر مشو از دوستی آل پیمبر    از بهر نجات بطلب وجه حسن را
گمنام فقیر آئینه در مجلس کوران
ارباب نظر قدر شناسند سخن را

※

اگر فرهاد میدید آن سراپا ناز تمکین را    روان در پای او میریخت نقد جان شیرین را
نبید خشک نتوان شد حریف عشق مرد افگن    بجنگ شیر نتوان برد هرگز تیغ چوبین را
اگر یار از نگه چشم او مرد کارت بود ناصح    برنگ من برون آئی دهی از کف دل و دین را
چون شمع باشد از خاکستر خود کحل بینائی
فقیر این سرمه در خور نیست هر چشم عافیت بین را

※

نه نوای چنگ سازد نه صدای رود ما را    تو به بزم گر نیائی ز طرب چه سود ما را
بفراقت ار گذشتم ز سر جهان عجب نیست    بسرت قسم که بی تو سر خود نبود ما را
نگشود جام باده گرهی ز کار رندان    سر نرگس تو گردیم که ز خود ربود ما را
توی آفتاب تابان همه خلق ذره تو    ز ظهور غیبت تست عدم وجود ما را



سر ما فقیر ساید بفلک ز خاکساری
چو کمال ماست نقصان چه غم از حسود ما را

※

داغ عشق تو گلی شد لاله حمرا مرا    تا برابراهیم گردید آتش سودا مرا
غنچه خاموش بلبل را بفریاد آورد    حسن محبوب تو آخر میکند رسوا مرا
ذره سان کم میشوم از ضعف در کویش ولی    آفتاب طلعت تو میکند پیدا مرا
ناله جان سوز و بار محنت و خون جگر    این همه باید کشید از یار بی پروا مرا
میتوان با یار عرض حال خود کردن فقیر
گر بحال خویش بگذارد دل شیدا مرا

※

شب هجران تو دل در تب و تاب است مرا    دیده بیدار ولی بخت بخواب است مرا
شوق دیدار گرفته است عنانش ورنه    عمر از قامت خم پا بر کاب است مرا
پستی طالع من همسر چاه افتاد است    بهره از یوسف خود چشم پر آب است مرا
گرچه عاشق نیم اما دل ناشادم هست    نیستم گنج ولی خانه خراب است مرا
این در فیض بروی همه کس نکشایند    زخم شمشیر جفا های تو باب است مرا
بی تو ظالم نفس من بشمار افتاده است    شب هجران چه کم از روز حساب است مرا
بسکه آتش زده حسن تو در اجزای چمن    شبنم گل بنظر اشک کباب است مرا
علم آنست که در سینه کند جای فقیر
در بغل از دل سیپاره کتاب است مرا

※

غنچه سان گل کرد آخر راز پنهانی مرا    کرد رسوای جهان سر بند گریبانی مرا

در فراقت گشته ام افسانهٔ شهر و دیار      ماه من یکشب ببزم خود نمی خوانی مرا
جان ندادم حیف هنگام وداع یار خویش      جان من گردید ازین ره دشمن جانی مرا
دانش آموز خرد بودم ولی آن طفل شوخ      کرد مشهور جهان آخر بنادانی مرا
گرچه از آئینه گویا میشود طوطی ولی      میدهد آئینه روی درس حیرانی مرا
کشتی طاقت بطوفان دادم از سامان اشک      ناخدای عشق گوید نوح سامانی مرا
بسته ام با زلف خوبان عهد همرنگی فقیر
رونق بازار باشد از پریشانی مرا

❋

ازان زمان که ز آغوش رفته یار مرا      بغیر پارهٔ دل نیست در کنار مرا
گذشت دلبرم از پیش و باخبر نشدم      ربود بسکه ز خود ذوق انتظار مرا
خطش دمید و جنونم بتازگی گل کرد      دگر چه گل کند آیا درین بهار مرا
برنگ شمع شبم روز شد ز شعلهٔ آه      نشاند بیتو باین روز روزگار مرا
چراغ داغ تو با خویش می برم در خاک      چه غم اگر نبود شمع بر مزار مرا
تو سرو ناز قدم چون بجلوه افشاری      ز دل چو آب روان می بری قرار مرا
فقیر خواهش بوسی ازان دهن دارم
دگر بهیچ کسی نیست هیچ کار مرا

❋

بسکه شد لبریز حسرتها دل پر درد ما      چشمهٔ خورشید یخ بندد ز آه سرد ما
ما ضعیفان را چه کاه از جا برد پرواز رنگ      کهربای جذبهٔ عشق است رنگ زرد ما
بسکه شد[1] اجزای ما پیچیده بوی زلف یار      عشق می سازد عبیر پیرهن از گرد ما

---

[1] در۔ (کلیات فقیر خدابخش)



باهزاران جان خریدیم از صبا گرد رهش      خسروان را داغ دارد گنج بادآورد ما
برده ام از دولت اثناعشر بازی چرخ      جز دو شش نقشی ندارد کعبتین نرد ما
کرد مشهور جهان حسن ترا عشق فقیر
گرمی بازارت افزون شد ز آه سرد ما

❋

فارغ از فکر دو عالم کرد بیهوشی مرا      شد دوای دردها آخر قدح نوشی مرا
ناز پرورد تغافل لطف نشناسد که چیست      میدهد مکتوب او یاد از فراموشی مرا
تارک جانم نبیند همچو زلف پیچ و تاب      با تو ناید راست سودای هم آغوشی مرا
میکشیدم حلقه در گوش بی ادب      گر باو چون زلف بودی راه سرگوشی مرا
از زبان بی زبانیها خبر دارم فقیر
داده آن چشم سخن گو درس خاموشی مرا

❋

میدهد تسکین خیالت بخت ناکام مرا      صبح امیدی منور میکند شام مرا
گر مرا نتوانی ای قاصد بکوی یار برد      پیش آن جان جهان باری ببر نام مرا
در محیط دهر چون گرداب اسیر گردشم      باز گشتی سوی آغاز است انجام مرا
آتش بیداد را از بسکه کردی شعله ور      سوختی ای بی مروت پخته و خام مرا
چشم من دارد حلاوت از خیال آن دهن      پستهٔ او در شکر بگرفته بادام مرا
یا علی در هند عمرم صرف بی آرامی است      برده شوق آستان بوس تو آرام مرا
سوی او سازم دل خود را مگر قاصد فقیر
ورنه هر قاصد ندارد تاب پیغام مرا

❋

ای از شراب لعل تو سرخوش دماغها　　عکس خط تو سرمه چشم ایاغها
چون سیل پر شتاب که راهش فتد بجر　　در راه جستجوی تو گم شد سراغها
آیا بود که سیر چراغان ما کنی　　بر سینه سوختیم شب هجر داغها
داغ جنون ز بخت سیاهی نمی برد　　روشن نمی شود شب ما زین چراغها

دور از نگار خویش بجز داغ دل فقیر
طرفی نه بسته ایم ز گلگشت باغها

※

پیر طریقت ساخته زاهد دل افسرده را　　کوری دلیل راه خود کرده چراغ مرده را
از عاشقان پاک او فرق است با اهل هوس　　آری نباشد نسبتی با مشک خون مرده را
شوریدگان عشق را بی پرده در رسوا مکن　　یکباره ظالم بر مگیر از روی خوبت پرده را
گر ما شرابی خورده ایم از دست رعنا ساقی　　ای زاهد بی معرفت بر ما مگیر این خورده را
پروانه سان در وصل هم خود را بر آتش می زنم　　خوگر بعشرت کی کنم جان بغم پرورده را
بر خون دلها می خوری جانها بغارت می بری　　ترسم که باشد سرکشی این خورده این برده را

خاک درش را از صبا گیرم به نرخ توتیا
من قدر می دانم فقیر زین گنج باد آورده را

※

در دور تنزل است عروج زمانه را　　صاحب نظر بصدر گزید آستانه را
دوران بخفته خیزی چشمت نمی رسد　　ما دیده ایم لیل و نهار زمانه را
گریه بذوق خانه خرابان او برند　　اهل جهان بسیل فروشند خانه را
آن مرغ دل که بال تجرد بر آورد　　بر طاق آسمان نهند[1] آشیانه را

[1] بنهند - کلیات



دست نگار رفته من از داغ حسرتست　　تا دیده است در خم زلف تو شانه را
هر کس بجلوهٔ تو سر ره گرفته است　　در رهگذار سیل بنا کرده خانه را

شد رتبهٔ فقیر بلند از فروتنی
نشو و نما ز خاک نشینی است دانه را

※

زمال حرص فزون شد دل توانگر را　　ز آب خشک لبی کم نگشت گوهر را
متاع آئینه را جوهر است گرد کسار　　هنر شکست دهد قیمت هنرور را
بشهر رحمت او جنس معصیت بابست　　بزهد خشک خریدیم دامن تر را
بغیر خاک نجف هیچ جا قرارم نیست　　که طفل تربت شناسد کنار مادر را

از سرنوشت جبینم شد آشکار فقیر
که سر بلندی بر باد میدهد سر را

※

کجا بسوی رقیبان فتد نظر ما را　　که جلوهٔ تو ز خود کرده بی خبر ما را
میان هستی ما و عدم تفاوت نیست　　برنگ خویش نمود است آن کمر ما را
بنقد داغ جنون خویش را فروخته ایم　　خریده است غم عشق او بزر ما را
مبین بظاهر ما گرچه تیغ عریانیم　　بود ز جوهر هر خلعتی ببر ما را
بسر برهنگی فقری بریم بسر　　کلاه خسروی تست درد سر ما را

سلیم و بلبل و ما و فقیر یک جنسیم
خریده است گل این چمن بزر ما را

※

دشنام او ز بوسه خبری دهد مرا　　این تلخ مژدهٔ ز شکر میدهد مرا

از زہر چشم جان زمن خستہ می برد — وز بوسہ باز جان دگر مید ہد مرا
زان می طپم بدام کہ ذوق اسیریم — صیاد اگر بداند سر مید ہد مرا
در جوی آب دہر مروت نماندہ است — در دیدہ نم بخون جگر مید ہد مرا
چون ذرہ من ببال و پر خود نمی پرم — خورشید طلعتی است کہ پر مید ہد مرا
تا دیدۂ بسوی من از ہوش رفتہ ام — چشم توی بجام نظر مید ہد مرا
افسردہ ہمچو سنگم اگر گرد روزگار — شوق تو اضطراب شرر مید ہد مرا
ساقی شراب ناب باغیار می دہد — خون می کند بساغر اگر مید ہد مرا

این نخل آرزو کہ نشادم بدل فقیر
جز اشک خون چکان چہ ثمر مید ہد مرا

❋

بخاک ما گذر افتاد باز جانان را — قیامت دگر آید بسر شہیدان را
غطش دمید و غم عاشقان دوبالا شد — کہ شام صبح قیامت بود غریبان را
ببزم وصل نہ دیدار دوست محرومم — کہ نیست فرصت نظارہ چشم گریان را
بیا بیا اگر آئینہ دیدنت ہوس است — برو نمای تو دادیم چشم حیران را

زغنچہ نتوان بود کم فقیر بیا
درین بہار تو ہم پارہ کن گریبان را

❋

ہر دم نمود حسن تو باغ دگر مرا — ہر لحظہ سوخت عشق بداغ دگر مرا
ہر چند پی بکوچہ دلدار می برم — دل باز می کشد بسراغ دگر مرا
از رہ نمی روم کہ بشبہا خیال دوست — دارد بہ پیش راہ چراغ دگر مرا
مست و خراب گشتہ ام و چشم او فقیر — تکلیف میکند بایاغ دگر مرا



زلفت کہ ہست کردہ شبہای تار ما — آوردہ صد بلا بسر روزگار ما
ای آنکہ اختیار دل ما بدست تست — رحمی بکن بگریہ بی اختیار ما
ہمچو شرر کہ در جگر سنگ خفتہ است — خوابیدہ بیقراری ما در قرار ما
دور از تو ہر نفس بدل خستہ دشنہ است — ای گل کجا تو آگہی از خارخار ما
عزم سفر ز گلشن کوی تو کردہ ایم — مانند سرو جز دل خود نیست یار ما
ما مست و بیخود از قدح چشم ساقیم — مستی فزاست گردش لیل و نہار ما

در عشق ضبط گریہ نمی آید از فقیر
ظالم شکست شیشہ دل در کنار ما

❋

در قلزم جدائی کشتی شکست ما را — از ما خبر بگوئید آن یار آشنا را
مردم ز بیقراری کو زلف آن پری رو — تا آورم بزنجیر صبر گریز پا را
خاک حریم جانان دارد بجبہہ من — ربطی کہ نیست ہرگز با دیدہ توتیا را
تنہا نہ خرمنم را ساقی ز تاب می سوخت — آتش بخرقہ در زد پیران پارسا را
کار تو زرق سالوس بار تو ننگ ناموس — ای عقل کاروبارت دیوانہ کرد ما را
گم کردہ ام بتی را در کوچہ خرابات — ای خضر راہ مستان بنما بمن خدا را
جان عزیز خود را در کار چشم[1] پسند — تا کی کنی گل آلود سرچشمہ بقا را
عارف براہ تحقیق مستغنی از دلیل است — کور است آنکہ سازد ہمپای خود عصا را

از من فقیر روزی این حرف باخرین گو
قد صار یا کراما لیلی بکم نہارا

❋

[1] جسم - کلیات

نبود بالش مخمل برای مجنون باب — سری بسنگ ملامت بنها دورفت بخواب

جدا از روی تو ای مه ستاره می شمریم — شب فراق تو از بهر ماست روز حساب

ببزم باده مرا گفت خوانمت روزی — بنای وعده شناسم که بود است بر آب

خیالت آمد و بیدار کرد بخت مرا — چنین خیال ندیدست هیچکس در خواب

ز گریه منع نما یار زغارت عاشق — کسی بسیل نگوید عنان ز راه بتاب

اثر ز ناله مجو گریه نامد نکند — نهال برنمید تا نسازیش سیراب

ز طبع عشق بدل فتح بابها داریم — رهی بسوی تو وا کرده ایم از هر باب

بخاکدان جهان گنج بی نیازی را
کسی نیافته غیر از فقیر خانه خراب

⁂

وصل کم جوی خلاص از هجران مطلب — درد را قدر بدان راحت ز درمان مطلب

منتهای ره عشق است بحسرت مردن — جان بده بوی از آن سیب زنخدان مطلب

ناوک غمزه خونریز از آن ترک نگاه — گر دلت نیست بجان تحفه سندان مطلب

باغ دنیا بحقیقت چمن تصویر است — زین گلستان گل مقصود بدامان مطلب

بشکر کاسه وارون فلک را یعنی — باده عیش ز میخانه دوران مطلب

دل تو شاهجهان است چه جوییش از این — یوسفت والی مصر است ز زندان مطلب

زلف زینگونه که از چهره پریشان داری — دگر از عاشق آشفته دل ایمان مطلب

از شمار ند برون آبله پایان رهت — این حساب از عدد ریگ بیابان مطلب

مطلب لذت گفتار نظیری ز فقیر
نیشکر حاصل مصر است ز کنعان مطلب

⁂



تا فتاد از زلف او عکسی در آب — آشنای سرمه شد چشم حباب

من نه از خودی روم دنبال او — سایه را سرگشته دارد آفتاب

ای دل از سیل فنا پر غافلی — باخبر شو خانه ات گردد خراب

مال دنیا کم نسازد حرص را — کس نشد سیراب از موج سراب

آب حیوان باد ارزانی به خضر — ما و خاک آستان بو تراب

تاب دیدن نیست ورنه یار من — همچو خورشید است دایم بی نقاب

وصل او را آرزو داری فقیر
گنج را می جوی ای خانه خراب

⁂

بسکه با کیفیت است امشب صفای ماهتاب — از قدح آورد ساقی رو نمای ماهتاب

سر صحرا گر میسر نیست در شبهای ماه — خانه را صحرا توان کرد از برای ماهتاب

خانه زاد جلوه حسن است عشق سینه چاک — تار و پود این کتان است از قبای ماهتاب

از چراغ مه نگیرد کلبهٔ عاشق فروغ — پرتو روی که می تابد بجای ماهتاب

خاکساری شیوهٔ روشندلان باشد فقیر
می کشد بر خاک مه دایم ردای ماهتاب

⁂

مرشد اهل سخن را جز صفای سینه نیست — درس طوطی را کتابی بهتر از آئینه نیست

در محبت چشم آزادی ادیب عشق گفت — در میان هفته اطفال ما آدینه نیست

جلوهٔ صبح وطن را شام غربت در قفاست — صاف مهر آسمان خالی ز درد کینه نیست

نیستم آگه ز تاراج تو بر یاران چه رفت — اینقدر از خود خبر دارم که دل در سینه نیست

تو گرفتار تو نتواند بمن همچشم شد — لاله سان داغ بدل دارد دلی در سینه نیست

بی نیاز است از نمد آئینهٔ ماه تمام — کاملان را احتیاج خرقهٔ پشمینه نیست

بی کمند آه ناتوانی فقیر آنجا رسید
اوج وصل آن پری بامی است کاز زینه نیست

※

باده را ذوق لب لعل می آشام تو نیست — قند را چاشنی تلخی دشنام تو نیست

خلعت نازبان سروروان می زیبد — بر ادای سرو که این جامه براندام تو نیست

گوش گل را خبری نیست ز فریاد هزار — غم ناکامی ما در دل خود کام تو نیست

آفتابی شود آئینهٔ از عکس تو ماه — حاجت بامه و خورشید در ایام تو نیست

چشم هر بی بصری آئینه دارت نسزد — گوش هر خیره سری در خور پیغام تو نیست

خط آزادی کونین گرفتاری تست — جای رحم است بر آن صید که در دام تو نیست

گل فردوس جنونم ندهد گر نوبت — نکشم بادهٔ کوثر اگر از جام تو نیست

دل که غافل ز تو شد دست خوش شیطاست — میبرد دیو بجنی که درو نام تو نیست

تازه تر گشت به پیری گل داغ تو فقیر
هیچ آغاز بدلچسپی انجام تو نیست

※

غم و عیش زمانه هر دو یکی است — دام این دشت و دانه هر دو یکی است

طائری را که با اسیری ساخت — قفس آشیانه هر دو یکی است

نه نهم رو بوادی مجنون — بی تو صحرا و خانه هر دو یکی است

کشتی را که ناخدا عشق است — قعر بحر و کرانه هر دو یکی است

هست مردم شکار سبحه او — شیخ را دام و دانه هر دو یکی است

بادشاه را بگو که پیش فقیر — خاک راه و خزانه هر دو یکی است



در مقابل چشم گریان یار جانان یاد داشت — کاروان گریهٔ یا یوسفی در بار داشت

شب خدنگ آه دل را از نگاه افتاده بود — مطرب ما نی نی تیر تو موسیقار داشت

زاهد خشک از فریب زلف کافرکیش او — همچو نال خامه زیر پیرهن زنار داشت

عاشقی از دست بیدادش جهت جان نبرد — غمزه از مژگان او صد تیغ در زنهار داشت

در طلب سر گشته بودم در وفا ثابت قدم — دل بیک حالت سکون سیر چون پرکار داشت

شاه را سر مایهٔ دولت اگر بالی هماست
راحت دیگر فقیر از سایهٔ دیوار داشت

※

همیشه چشم عاشق خونفشان است — بهار عشق بازی بی خزان است

مراد از خود کجا نطق و بیان است — زبان هم حرف او از ترجمان است

نمی دانم چه دارد نقطهٔ خاک — که سرگرم طواف آسمان است

جهان تنگ است از جوش خریدار — همانا یوسفی در کاروان است

زبانم محو مدحی از هما پرس — که در هر استخوانی مغز جان است

نهان در بندگی کار خدا نیست — بچشم عارفان صد داستان است

بتن زانرو بود آمیزش خاک — که پای عصمت دل در میان است

نباشد حرف دل را گوش محرم — نگاه آشنا او را زبان است

چرا نقش نجوید دل که او را — همین چشم و چراغ دودمان است

نشان دلبر خود از که پرسم — که با چندین نشانها بی نشان است

فقیر القصه یا رب چه جابیم
ز چشم تنگ محبوبان نهان است

دل ما با دل من بر سر جنگ آمده است　　باز در عشق مرا شیشه بسنگ آمده است

زاهد از کوچه مست آمده بر کس نه بدش　　گفت این کافر از شهر فرنگ آمده است

جام می نیست که دست تو شد قسمت غیر　　کشتی ماست که در کام نهنگ آمده است

صوفی از عالم نیرنگ بجو می تا کی　　سوی معشوق نظر کن بچه رنگ آمده است

بر سر غنچه نرفته است ز بید اغخزان　　آنچه از دست غمت بر دل تنگ آمده است

بر نخیزد چو من افتاده از خاک فقیر
در ره دوست مرا پای بسنگ آمده است

٭

بیمار عشق را بطبیب احتیاج نیست　　دردیست درد عشق که او را علاج نیست

خوبان به دوست بیکه بجز غمی خرند　　این نقد را بکشور ایشان رواج نیست

عشق از حساب روز جزا کرد فارغم　　پیداست اینکه بر دو دیوان خراج نیست

در بزم باده زاهد افسرده را مخوان　　این آب و خاک را بهم امتزاج نیست

بمن هما فقیر نباشد ز استخوان
شه را سعادت و شرف از تخت و تاج نیست

٭

پیش ما خسته دلان درد و دوا هر دو یکیست　　دم عیسی و دم تیغ جفا هر دو یکیست

یار هر جا که رود روی نگه جانب اوست　　مردم چشم من و قبله نما هر دو یکیست

گر تو ای ماه نقاب از رخ زیبا بکشی　　زنگ بر آئینه ما و جلا هر دو یکیست

آنچنان بسته ام از خویش نظر دور از تو　　کز آئینه مرا روی و قفا هر دو یکیست

با قد تو سرو سهی در لب گیا یکسان است　　با رخت مهر جهانتاب و سها هر دو یکیست

زان رو شد خور زلف تو چه بسیار نهاری از مد　　تیره روزان ترا صبح و مسا هر دو یکیست



هر چه از کان نمک آید باشد نمکین　　از لب بوسه و دشنام مرا هر دو یکیست

نعمت نقد بخود نسیه مکن ای زاهد　　باغ فردوس و رخ حور لقا هر دو یکیست

نیست ممتاز بفردوس تو نگر ز فقیر
بر سر کوی بتان شاه و گدا هر دو یکیست

٭

دولت وصل او نصیبم نیست　　چکنم طالع رقیبم نیست

بچه صورت بمن افتد نگهت　　سر و شکل نظر فریبم نیست

کرده در کوی او رقیب وطن　　جای آسایش غریبم نیست

چمنی را که زاغ نغمه سراست　　جای فریاد عندلیبم نیست

ای ستم پیشه از جفا بس کن　　که دگر طاقت شکیبم نیست

گشته ام از اقربا ز ماند فقیر
غیر ولی بیچکس قریبم نیست

٭

اخلاص ما یقین شد او را چنان که هست　　جان داده ایم یار هما بگمان که هست

گفتی دلا که دلبر ما ظلم پیشه نیست　　ایمن مباش از آن بت نامهربان که هست

روی تو دیگه بخورشید زد مثل　　گویا ندیده حسن ترا همچنان که هست

چشمم سفید شد بره انتظار دوست　　فکر منش نبود مرا آن گمان که هست

یکبار هم نسوخته دل او بحال من　　مجنون کرا بخت از غم لیلی همان که هست

دوران قرار صلح نداده است با کسی　　دایم این قرار بود آسمان که هست

از کف ما بجد مصرع فاله دل فقیر
یا ما دلی نمانده و او را گمان که هست

---

۱. این - کلیات - ورق ۷۲-

مفلسم لیک دلم را ہوس نعمت خود نیست          چشم من آبلۂ دست تونگر خود نیست
گرتر و خشک جہان است بکام تو چہ سود          باتو منعم لب خشک و مژۂ تر خود نیست
خواب آرام بدور تو نکردیم شبی          ای فلک دیدۂ ما دیدۂ اختر خود نیست
بوالہوس بی دل پر داغ چہ لافی از عشق          درکف دعوی تو حجت و محضر خود نیست
نقد جان در عوض بوسۂ تو ا نکرد فقیر
کہ خریدار فقیر است تونگر خود نیست

٭

با قد یار لاف صنوبر تمام نیست          رعنا اگرچہ ہست ولی خوش خرام نیست
گیرم کہ لعل یار بود آب زندگی          اما چہ حاصل است چو ما را بکام نیست
مہ دعوی جمال کند با رخش ولی          پیداست از کلف کہ بدعوی تمام نیست
جای کہ نقل از لب و چشم تو می کنند          مشتاق عشق را ہوس نقل و جام نیست
ما بیدلان بروی ناب زندہ ایم          قالب تہی کنیم اگر می بجام نیست
عشاق کی ز طعنۂ زاہد زجا روند          خاصیم و گوش ما بحدیث عوام نیست
حیرت زبس بعالم دیگر نگہم کشید          در روزگار من اثر صبح و شام نیست
آہنگ نالۂ دل ما را نکرد فہم          بیچارہ شیخ راخبری زین مقام نیست
از بس بسینہ داغ بتان سوختم فقیر
در کورۂ دلم اثر از فکر خام نیست

٭

ہر کہ ہمچو حباب دیدہ ور است          از جفای فلک بچشم تر است
از دل ما خبر چہ می پرسی          تا خبر از تو یافت بی خبر است
کشتی بادہ ام بدہ ساقی          عمر مانند آب درگذر است

[1] مستان - کلیات - ورق ۲۳۔



در سہی قامتان وفا نبود          راست گفتند سرو بی ثمر است
کی شکایت کنم ز فقر فقیر
دلم از داغ عشق گنج زر است

٭

زندگی نقش بر آبی بیش نیست          ساغر عشرت حبابی بیش نیست
لاف بیداری درین عالم خطاست          آنچہ می بینیم خوابی بیش نیست
از دل آگاہ بجو آب بقا          چشمۂ حیوان سرابی بیش نیست
کی بسوز دل رسد آن ترک مست          بر سر آتش کبابی بیش نیست
درۃ التاج سران روزگار          در حقیقت قطرۂ آبی بیش نیست
تار پود لفظہای خوش قماش          بر رخ معنی نقابی بیش نیست
من کمند فتنہ را دیدم فقیر
از خم آن زلف تابی بیش نیست

٭

ہر کجا چشم است محو حسن عالمگیر اوست          حیرت آباد جہان آئینۂ تصویر اوست
بسکہ با بیداد آن ابرو کمان خو کردہ ام          زندگی وابستۂ ما را بادم شمشیر اوست
قصۂ دور و دراز زلف یار از ما مپرس          ہر کجا دیوانہ دیدیم در زنجیر اوست
میکنی آباد محبت خانۂ دنیا چرا          غیر ویرانی چہ دیگر حاصل تعمیر اوست
چشم فتانش نہ سرخ است از خماری فقیر
خون مظلومان عشق است اینکہ دامنگیر اوست

٭

کفر باشد خواہش ما پیش خواہشہای دوست          آرزوی ما درین حضرت فنای آرزوست

سر به پیش افگندن از خجلت نماز ما بود    پیش ما از شرم عصیان آب گردیدن وضوست
نغمهٔ وحدت بهر جا دارد آهنگی دگر    دل درد بلبل فغان و ناله شد در غنچه بوست

عشرت منعم بسیم و زر اگر باشد فقیر
دیدهٔ تر عاشقان را مایهٔ صد آبروست

٭

درد صالش مرا عجب حال است    دل پر از گفتگو زبان لال است
نرگس فتنه است و دنباله    فتنه دیگرش ز دنبال است
زامند از زبان هجر مپرس    روز او ماه و ماه او سال است
دامنی زد بر آتش شوقم    تو گل من که جامه اش لال است
کیست دانی ببزم دشمن مال    آنکه در بذل دشمن مال است
گوشه گیر ایمن است از آفات    زیر پر دام مرغ ما زال است

دولت جاودان فقیر از ماست
فقر ما بار نخل اقبال است

٭

با درد او صبر و تحمل گریز نیست    این درد دیگر است که درمان پذیر نیست
درویش را که زینت ظاهر هوس کند    پیرایه بخوبی نقش حصیر نیست
جان میکنم ز دیده روان سان جوی خون    در عاشقی معامله جوی شیر نیست

دهلی ز دست غارت افغان خراب شد
این جا اگر غنی طلبی جز فقیر نیست

٭

دارم دلی بسر درد لاویزش احتیاج    زخمی بیک نگاه نمک ریزش احتیاج



از تیغ و تیر هر چه رسد میخورم مدام    بیمار عشق نیست به پرهیزش احتیاج
زخم دلم لبی به تمنا گشوده است    دارد مگر به لعل نمک ریزش احتیاج

ساقی فقیر اسیر خمار است می بده
دارم سری به ساغر لبریزش احتیاج

٭

دردمار اکند آن زلف گره گیر علاج    بهر دیوانه بود حلقهٔ زنجیر علاج
هر که او ماه بسر زلف تو پرچان زده نیش    که آن آنخسته درون آن زخم چو شمشیر علاج
تا مرهم [illegible] کرد [illegible] او نما    منکر آن را نبود خبر دم شمشیر علاج
سالک از عشق تو چه شد که نم شود کارش بدا ست    غیر آتش نپذیرد کجی تیر علاج
در عشاق گریزند ز خیال درمان    نپذیرد مرض عشق بتقدیر علاج

خاکساری بجد چاره کار تو فقیر
بهمان رنگ که مس را کند اکسیر علاج

٭

نیست با چشم ترم آن گل خندان محتاج    کی شود گلشن فردوس بباران محتاج
من بی برگ و نوا در چه حسابم ای گل    که بدیدار تو هستند هزاران محتاج
پاس اسباب جهان داشتن از بیخردیست    کشت تصویر نباشد به نگهبان محتاج
بیتو بودیم بصحرای جنون مونس هم    [illegible] انی دوست بگریبان محتاج
خسروان را مدد از پهلوی درویشانست    [illegible] بخم زلف پریشان محتاج
مژگان چشم بدامان قیامت دارند    خاک ماست بآن گوشهٔ دامان محتاج

ردیف الحاء

عاشق شب هجران نخورد هیچ غم صبح    شام بخیال تو بود رشک دم صبح

زلف است که بر عارض یار است پریشان
یا شام شده گرم طواف حرم صبح

یک قطره بود شام سیه بختی ما را
جائیکه مساویست وجود و عدم صبح

با ذوق شب وصل ندانیم گزان سد
در کلبه ما اول شام است دم صبح

صبح و شب من بی‌تو با اندوه الم رفت
حاصل ز تو اندوه شب است و الم صبح

حسن تو برد گر بسر مهر شبیخون
قامت نکند راست ز خجلت علم صبح

از ابر نقابست نمایان مه رویت
چون بیضه خورشید ز زیر شکم صبح

از گوشهٔ حسن تو خوبان شده پامال
چو خیل کواکب سپاه حشم صبح

*

روشن[1] شود آئینه تاریک شب از صبح
برخیزدم صدق بهنگام طلب از صبح

گویا خبر از حسن غیور تو ندارد
پیش تو ز خورشید زند دم عجب از صبح

از تیغ تو رفته است بخاق سر روز
آن ظلم که در خواب غنوده است شب از صبح

افسرده نگردد دل افروخته عشق
تا روز قیامت نرود تاب و تب از صبح

صد بار فقیر این چمن فیض گل آورد
یک بار نچیدی گل عیش و طرب از صبح

*

زخون دل نه همین شد مرا گریبان سرخ
که شد ز گریهٔ من دامن بیابان سرخ

می دو آتشه آئینه دار این معنی است
که در دو نشاه بود روی می‌پرستان سرخ

بحشر سوختهٔ عشق سرخرو خیزد
که وقت صبح بود آفتاب تابان سرخ

چو غنچه مشق خط زخم من نه امروز است
که لوح ابجد من بود در دبستان سرخ

بمصر خوبی او یوسفی ندارد رنگ
مگر شود ز خجالت رخ عزیزان سرخ

---

[1] یہ غزل دیوان میں نہیں ہے ۔



تو گل بدامن ازین باغ میبری بیدرد
فقیر را شده از خون دیده دامان سرخ

*

نگه در چشم او شوخ حجاب آلوده را ماند
سخن در لعل او نقل شراب آلوده را ماند

ز گلگشت گلستان تماشا سخت محرومم
نگاه من ز حیرت پای خواب آلوده را ماند

چنان گل شد ز خون دیده ام خاک ره جانان
که پای شوق من دست خضاب آلوده را ماند

عجائب زهر چشمی کرده ساقی باز در کارم
که موج باده ابروی عتاب آلوده را ماند

نباشد دور اگر با خود برد چشم نزارم را
سرشکم در رهش سیل شتاب آلوده را ماند

عجب کیفیتی در شاهدان باغ می‌بینم
ز شبنم برگ گل لعل شراب آلوده را ماند

بغفلت بسکه روز و شب سر و کار است مردم را
زمین و آسمان یک چشم خواب آلوده را ماند

فقیر النوع بلاک بوسه باید شد که جانان را
لب از دشنام قند زهر ناب آلوده را ماند

*

خوشا اشکی که با لخت جگر از چشم تر غلطد
خوشا آهی که تا از لب بر آید در اثر غلطد

برد دل ذوق شهد لطف از زهر عتاب او
که حرف تلخ از آن لبهای شیرین در شکر غلطد

اگر شمشیر ظالم میخورد برابر برق آسا
چو وقت آید برنگ قطرهٔ باران بسر غلطد

ز بس در راه شوقت بیقراری گشته همپایم
چه ماهی نقش پای من بخاک رهگذر غلطد

بروی کار من در عاشقی آن روز رنگ آید
که مژگان چون رگ یاقوت در خون جگر غلطد

فقیر از نالهٔ اشکم ز چشم تر فرو ریزد
چنان کز نفخ صور انجم بروی یکدگر غلطد

*

مست و ساغر بکف آن شکر قمری آید — بمن از بیخبری باز خبر می آید

در فراق تو مرا کار باشک و آه است — دگر از دیده و دل بیتو چه بر می آید

لذت درد بهر بوالهوس آسان ندهند — آب در دیده بصد خون جگر می آید

دیده هر جا که شود مایل دیدار بتان — نقش رخسار تو می بیند تر می آید

از اسیران محبت خبرم نیست ولی — در قفس مشت غباری بنظر می آید

بیشتر می برد آن تیغ که جوهر دارد — ترک تجرید ز ارباب هنر می آید

میگذارم سر خود در قدم یار فقیر
اینقدر با زمن خاک بسر می آید

※

دامن کشان ز صحبت من یار میرود — کارم ز دست دوست[1] ستم از کار میرود

هردم ز لخت دل که بمژگان رسد مرا — منصور تازه بسر دار میرود

خواهند باخت مشتریان نقد هوش را — زین یوسفی که بر سر بازار میرود

مشکل که ذکر قند مکرر شود سفید — هر جا حدیث یار بتکرار میرود

دیگر فقیر مست دو غزلخوان بکوی یار
مانند عندلیب بگلزار میرود

※

بظلم زد نگهش زخم نمایانی چند — لبش از خنده بران ریخت نمکدانی چند

[…]ش از کوچهٔ ما یار بصد ناز گذشت — همچو کاکل بقفا داشت پریشانی چند

غیر آئینه دل محرم دیدارش نیست — صورت حال بپرسید ز حیرانی چند

غنچه وا شد اگر در چمن از باد بهار — ما ببوی تو دریدیم گریبانی چند

---

[1] دوست من از ۔ کلیات ۔ ورق ۳۴



حسن او از عرق شرم در چنیں ابرو — کشتی صبر مرا داده بطوفانی چند

نشود کشتهٔ امید ز باران سیراب — باید این مزرعه را دیدهٔ گریانی چند

راحت عالم تجرید کرا نیست فقیر
میتوان باخت در این سر و سامانی چند

※

جای که گرد راه تو از دور شد بلند — در هر طرف ز منظران شور شد بلند

در هر مقام نغمهٔ عشاق یک نوا است — گاه از حجاز و گاه ز شاپور شد بلند

هر جاست گر خرام ترا سیل گفته ام — تا آمدی ز هر طرف شور شد بلند

کردم تبسم نمکین ترا خیال — گلبانگ خنده از لب ما شور شد بلند

عشق تو بعد مرگ ز خاکم کشید سر — چون گرد باد ناله ام از گور شد بلند

شان من از حلاوت معنی فزوده است — آری ز شهد رتبه ز زنبور شد بلند

کردم بخود خطاب که اینک رسید یار
هر جا فقیر آتشی از دود شد بلند

※

تا تیغ غمزه در کف آن مست ناز بود — حسرت نصیب خضر ز عمر دراز بود

آخر نواخت تیغ جفا بر سر رقیب — داد از جفای دوست که دشمن نواز بود

امشب نیامدی و ز چشمم رمید خواب — این در بانتظار تو تا صبح باز بود

خود دیدهٔ بدیده من حسن خویش را — حیرانیم برای تو آئینه ساز بود

روشن ز شمع گشته شد این مدعا بمن — کاب بقا چکیده فیض گداز بود

اقلیم دل ز غارت خوبان خطر نداشت — ناز تو در قلمرو ما یکه تاز بود

از ترک اختیار هم آغوش رستم — بیچارگی فقیر مرا چاره ساز بود

تاخون دل ز دیده بداماں نمی رسد
چون شمع کار گریه به پایان نمی رسد

جائیکه عشق داده غبار مرا بباد
آوارگی بریگ بیابان نمی رسد

درجوی زہد خشک رسد آب از کجا
در دور ما که باده بمستان نمی رسد

میراث حسن از مه کنعان بحکم شرع
تا یار ما بود بعزیزان نمی رسد

از بس حریص دلبری افتاده زلف یار
نوبت بدلربای مژگان نمی رسد

با یار نوخطان دگر را چه نسبت است
آری کتاب شعر بقرآن نمی رسد

چون مور جا بکنج قناعت گرفته ایم
دعوی ملک ما بسلیمان نمی رسد

همطرحی امید نباید زما فقیر
دعوی سلطنت بگدایان نمی رسد

※

زین تغافل ہا که حرف امتحانی میشود
بوالہوس داند که عاشق را زبانی میشود

تا بجا آرد سپاس نعمت درد ترا
ہر سر مو بر تن زارم زبانی میشود

ہر غباری کز سر کوی تو میگردد بلند
بہر آزار دل من آسمانی میشود

میکند ہر کس که یکدم باسگ کویت قران
او در اقلیم وفا صاحب قرانی میشود

نیست حرف عشق در فرہاد و مجنون منحصر
رفته رفته حرف ما ہم داستانی میشود

یار در آغاز خط کام رقیبان میدہد
نوبہارش تا رسد با ما خزانی میشود

آشنا روزیکه با طرز فغانی شد فقیر
نقش می بستم که آخر نکته دانی میشود

※

با من آن بیداد کرد در موسم خطیار شد
خط او زخم دلم را مرہم زنگار شد

خانمان سوز است ہر آہی که از دل میکشم
زین زمین نخلی که سر بر کرد آتشبار شد



گفتم اورا گر بیابم دست در دامن زنم
کار چون با دامنش افتاد دست از کار شد

آخر آن نازک کمر از اہل دل الفت برید
بر نہال قامتش دل بستن بار یار شد

دانہای سبحه یکسر حرف دام شید کرد
عاقبت تسبیح زاہد رشتهٔ زنار شد

بوالہوس ہم رفته رفته با جفایش خو گرفت
آخر این انگاره از سوہان زدن ہموار شد

لذت قند مکرر می دہد شعر فقیر
تا زبانش وقف طرح حیدر کرار شد

※

نیست راکی بخود بقا باشد
ہستی خلق از خدا باشد

دل عارف چو مرغ قبله نما
روی او جانب خدا باشد

بہر چشمی که جلوه مشتاق است
ہر کف خاک توتیا باشد

ہستی ما ز پہلوی یار است
سایهٔ بی شخص خود کجا باشد

بی تو من زندگی نمی خواہم
گر تو خواہی چنین روا باشد

دل که آئینه جمال تو نیست
پارهٔ سنگی است دل کجا باشد

انتقام از زمانه میگیریم
آن ستمگر اگر ز ما باشد

چه ز بیگانہا طمع داری
یار باید که آشنا باشد

خانه در کوی او گرفت فقیر
فقر ہمسایهٔ غنا باشد

※

زمین گیر قناعت را اگر آتش بجان گیرد
از آن بہتر که کام خویشتن از آسمان گیرد

ز من روزیکه چشم شوق او دل برد دانستم
که ترک من باین عزم درست آخر جہان گیرد

ز حال ما سمند طنیان آگه نه ناصح
که ترک من باین عزم درست آخر جہان گیرد

رباعی نیست زاہد را ز دام وہم و پندارش  سبک از خود برون آید اگر رطل گران گیرد
بہار آمد کہ بخشد گرمی ہنگامہ گلشن را  سراپا شاخ گل آتش شود در بلبلان گیرد
دمی گرمی دل خواہم کہ بنویسم با وحرفی[1]  دوات از خانۂ انگشت تحریر در دہان گیرد
فقیر آسان کند کلک حزین دشوار عالم را
ہما را در گلو ہرگز ندیدم استخوان گیرد

※

ہرکس حسنی بہ بر ندارد  نخل عمرش ثمر ندارد
دادم دل را بدست طفلی  گر حال دلم خبر ندارد
برخاک رہت گذاشت سر را  دیوانہ سر دگر ندارد
با زخم غمت چہ سان برآید  چون غنچہ دلم جگر ندارد
از صندل چارہ بی نیازم  عشق اینہمہ درد سر ندارد
نتوان بقضا ستیزہ کردن  ورنہ فلک این قدر ندارد
عاشق چو سفر کند ز کویت  زادی جز زخم بر ندارد
اسرار نبوت از علی پرس  این شہر در دگر ندارد
با سیمتنان چہ چارہ سازد
بیچارہ فقیر زر ندارد

※

ہرکس سر راہ یار دارد  از ہر دو جہان کنار دارد
دل گوش نمید ہم بحرفی[2]  مجبور من اختیار دارد
جز دل کالای عاشقان نیست  این قافلہ شیشہ بار دارد

---

۱ دمی گرم دل خواہم .... کلیات ورق ۲۹ ، ۲ بحرفم - کلیات ورق ۴۲



در عشق تو بیقرار باشد  دل با تو ہمین قرار دارد
عید قربان است امروز  جانان ہوس شکار دارد
تا دل ز تو شد برید از ما  دیگر از ما چہ کار دارد
چون غنچہ بہر کجا دلی ہست  از عشق تو خار خار دارد
خبر است کہ عیش از و شود تلخ  لذت دل بیقرار دارد
من عاشق ہمت فقیرم
کز صحبت شاہ عار دارد

※

لب خیال کجا پای نازنین تو بوسد  بعالمی کہ توی آسمان زمین تو بوسد
سحر چو طرہ کشای بہ پیچ و تاب در آیم  ز رشک این کہ صبا زلف عنبرین تو بوسد
بمصر حسن تو آن یوسف ستارہ بقای  کہ مشتری بہزاران شغف جبین تو بوسد
حباب بادہ سر از جیب آفتاب آرد  لب پیالہ اگر لعل آتشین تو بوسد
بدست بوس تو کی در خورم کہ پنجۂ خورشید  در آتش است ز حسرت کہ آستین تو بوسد
امید کام ز لعلت نباشد اہل ہوس را  مجال بر مگسی نیست کانگبین تو بوسد
فقیر مایۂ شعرت فزود طرز فغانی
ملک ز سدرہ فرود آید و زمین تو بوسد

※

حریفانی کز ان لب کام دارند  چہ باک از تلخی دشنام دارند
بصورت گرچہ خوبان بی نیازاند  ولی در دلبری ابرام دارند
نگہ دلہا اسیر دام او کرد  مرا مردم عبث بدنام دارند
دمی دم درکش ای صور قیامت  شہیدانش بخود آرام دارند

تهی دستند شاهان در حقیقت　　نگین را از برای نام دارند
تغافل خاص از بهر فقیر است
نگاه لطف خوبان عام دارند

⁂

ز درد محبت نشانی ندارد　　مگر زاهد شهر جانی ندارد
چو شمع سحر با دل پر شکایت　　به پیش تو عاشق زبانی ندارد
بر احوال آن بلبل دل بسوزد　　که در گلشن آشیانی ندارد
ندیدم خوش ابروی کز پی دل　　خدنگ جفا در کمانی ندارد
بمی دلق تذویر بفروش زاهد　　زبانی ندارد زیانی ندارد
چه لذت برد عندلیب از وصالش　　بهاری که در پی خزانی ندارد
به سودای دنیای دون وا رسیدم　　بجز سود دیگر زیانی ندارد
فقیر از دل ما بجو یوسفت را
که این جنس هر کاروانی ندارد

⁂

پنجهٔ عشقم گریبان میکشد　　دل بآن برگشته مژگان میکشد
از گل فردوس بیش ما مکو　　خار راهش دامن جان میکشد
روز محشر هم بت مغرور ما　　دامن خود از شهیدان میکشد
کی تواند شد دل ناس جمع　　نقش آن زلف پریشان میکشد
هر که عاشق را نصیحت میکند　　توتیا در چشم گریان میکشد
بار غم خون جگر آه فراق　　دل چها از دست هجران میکشد
گر چنین ناز تو دلها خون کند　　کار چشم ما بطوفان میکشد



سبزه خط توی بالد بخویش　　کاب زان چاه زنخدان میکشد
غنچه در پیش دهانت ای صنم　　سر ز خجلت در گریبان میکشد
نشاه دارد از می وحدت فقیر
جام عشق شاه مردان میکشد

⁂

خرد از عهدهٔ دیوانگی بیرون نمی آید　　ز مجنون آنچه می آید ز افلاطون نمی آید
کرامت کن ز مینای دلم ته جرعهٔ ساقی　　که از جام شراب عیش بوی خون نمی آید
کجا نادان طرف با اهل معنی میتواند شد　　بلی از خر سبکرفتاری گلگون نمی آید
نباشد تا مرا پیش نظر سرو گل اندامی　　غزل رنگین نمی خیزد سخن موزون نمی آید
قیامتها که بر من رفته است از گردش چشمی　　بصد دور دگر از گردش گردون نمی آید
شفای خسته جان در اشارات ست حشمت را　　بدست بو سینا نبض این قانون نمی آید
مکن ناصح عبث تکلیف ننگ و نام در عشقم　　ز من این کار می آید ولی اکنون نمی آید
نباغ حسن و خوبی تازه سروی بر نمی خیزد　　کاز کوی وفا دامن کشان در خون نمی آید
فقیر اندیشه کونین را از دل بدر میکن[1]
ولی اندیشه خوبان ز دل بیرون نمی آید

⁂

آن شاهد زیبا خط شبرنگ بر آورد　　فریاد که آئینه ما زنگ بر آورد
خونابه فشانیم بر خسارهٔ کاهی　　مارا غم عشق تو باین رنگ بر آورد
در قسمت ما بود پس از مردن فرهاد　　آن درد که آه از جگر سنگ بر آورد
ممنون هواداری چشم تر خویشم　　کز گلبن صلح تو گل جنگ بر آورد

---

[1] بدر کردم - کلیات ورق ۴۵

گر شادی وصل است که مرغوب نباشد　　ما را که فراقت بدل تنگ بر آورد
زان روی که در حسن توی همسر شیرین　　باکوهکنم عشق تو هم سنگ بر آورد
شوق تو مرا از هوس نام رهانید　　عشق تو مرا از کرد ننگ [illegible] درد
بر بوی تو رفتم سحری جانب گلزار　　دد از [illegible] من مرغ شاهنگ [illegible] ردد
آبی که در دعکس فتاد از گل رویت　　از شیشه حبابش می گلرنگ بر آورد

این نقش که از کلک فقیر آمده بیرون
مانی است که از جیب خود از ننگ بر آورد

※

شیشهٔ دل را شکستی زان بت خودبین رسید　　بیمروت بر سرم در ساعت سنگین رسید
مرد عارف هرچه آید بر سرش مطلوب اوست　　بر سر فرہاد زخم تیشه هم شیرین رسید
از وطن پر کنده ام دلرا در غربت خوشم　　غنچه ام بشگفت تا در دامن گلچین رسید
بستر کمخاب[۱] این سرمایهٔ راحت نداشت　　عاشقان را از دم تیغ جفا بالین رسید
شیشهٔ را کنون بر طاق نسیان میزنم　　از لب لعل تو ما را باده رنگین رسید

تا بوصف قامتش برجسته شد شعر فقیر
از دبیر آسمان در گوش تحسین رسید

※

جان ز قید جسم چون یابد خلاص آگه شود　　تا صدا شد از جرس بیرون دلیل ره شود
گر ز دنیا دست برداری عزیز عالمی　　هر که چون یوسف ازین زندان بر آید مه شود
بی غبار آینه را صورت نمی بندد جلا　　دل چو بیند خاک مال روزگار آگه شود
گر سخن از خلد گوید باد خاکش در دهان　　هر کرا خاک سر کوی تو منزل گه شود
یار ما از روی لطف و قهر روز و شب فقیر　　گاه گیرد صورت خورشید گاهی مه شود

[۱] بستر کمخاب　دیوان (خدا بخش)



هر که از کوی شما می آید　　دیده ام رو بقفا می آید
سوختن آب شدن خون گشتن　　این همه از دل ما می آید
نیست از منزل دلدار اثری　　نالهٔ دل ز کجا می آید
جان ره آورد عزیزان دارند　　از رهش باد صبا می آید
نام آن بت اگر از ما پرسند　　بر زبان نام خدا می آید

※

بر جنونم وسعت صحرای امکان تنگ بود　　پای در دامن کشیدم زانکه میدان تنگ بود
در خم زلف تو دیگر جای دل بستن نماند　　خانهٔ زنجیر بر جوش اسیران تنگ بود

تا نگاهی کرد سوی من ز خود رفتم فقیر
وقت من در عاشقی چون چشم جانان تنگ بود

※

تا جلوه گر بچشم من آن رشک حور بود　　نظاره از کمال ضیا شمع طور بود
زاهد نعیم خواست بمنعم نبرد راه　　بر قصر چشم دوختنش از قصور بود
از معرفت بزاهد شبخیز بهره نیست　　خفاش در تجلی خورشید کور بود
در جنب وسعت دل ارباب معرفت　　صحن سپهر تنگ تر از چشم مور بود

درد سریست حرص که در چاره اش فقیر
آن صندلی که سود دہد خاک گور بود

※

کفر و دینم یکی شد آخر کار　　سر سبحه بگردن زنار
نیست در کار چشم وا کردن　　می تراود ز دیده ها دیدار
یار در چشم و دیدنش مشکل　　راه نزدیک و طی شدن دشوار

گوہر شب چراغ اگر خواہی    رو بدست آر دیدۂ بیدار
جان ما پردہ است جانان را    نتوان گفت پردہ را بردار
ہستی حق بنای ہستی ماست    ہمچو دیوار و صورت دیوار
صورتحال رفتگان بنگر    پست آئینہ ایست لوح مزار
گرچہ بی پردہ است یار ولی    ننماید بکوری اغیار
رفتن ماست آمد آمد او    روز آید چو بگذرد شب تار
یوسف اینجا چہ عوض حسن دہد    یک خریدار نیست در بازار

یار پیوستہ در سراغ من است
با فقیر است شاہ را سرکار

*

ای شمع نقاب از رخ افروختہ برگیر    پروانہ دلسوختہ را سوختہ ترگیر
از جام عتاب تو چو من کس نبرد ذوق    آتش شود در جان من سوختہ برگیر
ای آنکہ شدی مرحلہ پیمای رہ عشق    این رہ بقدم طی نتوان کرد ز سر گیر
آوارگی عشق چہ محتاج دلیل است    ای خضر ازین راہ برو راہ دگر گیر
زخم است محک از پی عیب ہنر تیغ    آہی کہ کشیدیم سراغش ز اثر گیر
خواہی کہ کند نیست جلوہ ہستی    این شیوہ برو یاد ازان موی کمر گیر
تا نخل تمنای جہانت ببر آید    آن سرو روان را نفسی تنگ ببر گیر
از بحث و جدل رہ نتوان برد بتوحید    این نکتہ بدیہی است کم علم نظر گیر
چون پرتو خورشید ز فیض دل روشن    سرتا سر عالم ہمہ در لعل و گہر گیر
قلب و سرہ راہست اگر طبع تو معیار    چون سکہ سخنہای مرا جملہ بزر گیر
عمریست کہ افتاد بفکر خم زلفی    زنہار فقیر از دل آشفتہ خبر گیر



زلف برخ آشفتہ ای رشک پری ناز    دارد بمن ز آن فتنہ گری باز
ز اندیشۂ رسوائی من ای بت بیباک    در پردہ برفتی و نہان پردہ دری باز
می خوردۂ از ساغر اغیار مگر دوش    ای لالہ رخ امروز برنگ دگری باز
صد بار دلا شیشہ تو آمدہ بر سنگ    وز کوچہ این سنگدلان میگذری باز
چون پرتو خورشید کہ در آب نماید    در پردہ نہان گر شدہ جلوہ گری باز
دل را بنگاہی ز من زار ربودے    جان می بری این بار اگر مینگری باز
پیوستہ چو جان است ترا در دل من جای    وز حال دل شیفتہ ام بی خبری باز
گر باز گرفتم ز تو ظالم دل شیدا    دانم کہ از من بنگاہی ببری باز
گیرم کہ دہد گوش بتو آن بت بیرحم    ای نالہ چہ حاصل کہ نہان بی اثری باز

بر گریۂ من خندہ زد و گفت فقیرا
کاردبجہ افتاد کہ با چشم تری باز

*

فصل داغ دل گذشت و کرم انعامم ہنوز    نوبہار آخر شد و مست و غزلخوانم ہنوز
شب بفکر تو گلی سر در گریبان بودہ ام    غنچہ سان بوی گل آید از گریبانم ہنوز
نام فریاد بگوشش نرسیداست ہنوز    آنچہ من میکشم از وی نکشیداست ہنوز
خبر از شور جنون من ناکامش نیست    نمکی از لب لعلی نچشیداست ہنوز[1]
دامنش را نگرفتہ است تمنای گلی    خار این راہ بپایش نخلیداست ہنوز
نیست از شورش سیلاب سرشکم آگاہ    بر رخش قطرہ اشکی ندویداست ہنوز
مست ناز است و ز خون خوردن ما آگہ نیست    بوی این می بدماغش نرسیداست ہنوز
کی فقیر از دل صدپارہ ام آگاہ شود    نازنینی کہ گریبان ندریداست ہنوز

---

[1] نمک از لب لعل نچشیداست ہنوز دیوان (خدا بخش)

خطش دمید وخم زلف دلکش است هنوز      فشرد شعله جانها د آتش است هنوز
شدیم خاک وز پا آه آتشین نه نشست      گداخت شمع ولی شعله سرکش است هنوز
صفای عیش غنیمت شمار بیش از خط      شراب لعل لب یار بیغش است هنوز
زخط اگرچه بجوی جمالش آب نماند      شکنج زلف چو قلاب دلکش است هنوز
بنای دهر چنان بی ثبات وصل هوس      بفکر خانه وسقف منقش است هنوز
تو کرده جا بدل من چو آب در آهن      بجستوی تو نعلم در آتش است هنوز
بیک نگاه دگر شیخ راز خود ستان      میان عقل و جنون در کشاکش است هنوز

کتان طاقت من چاک شد فقیر ولی
نگاه محو رخ یار مهوش است هنوز

※

دشنام تلخ را لب دلبر کند لذیذ      این زهر را حلاوت شکر کند لذیذ
تلخی کز آن دو لعل شکر بار سر لذیذ      آن تلخ را چو قند مکرر کند لذیذ
طوطی دگر ز شرم نگردد شکر شکن      کلکم چو از لب تو سخن سر کند لذیذ
بس زاهدان که نقد دل و دین نمی دهند      لعلت ببوسه چون لب ساغر کند لذیذ
نو شیست در لب تو که چون رشته نبات      تحریر وصف او خط مسطر کند لذیذ
تشبیه کردهم بلبت جام باده را      در کام تلخی می احمر کند لذیذ

شعر فقیر را که بلذت چو شکر است
حرف دهان یار فزونتر کند لذیذ

※

ماجرای گریه بی اختیار ما مپرس      عاشقم از سر گذشت حال زار ما مپرس
لاله داغ است وگل زخم است در پهلوی هم[۱]      می شوی دیوانه از فصل بهار ما مپرس

۱؎ لاله داغ وگل زخم ست در پهلوی من. کلیات - ورق ۶۸



نگهش داشت بمن لطف نهانی که مپرس      حرف زد با من شیدا بزبانی که مپرس
لمر نازک اوگرچه یقین است که نیست      از سخن بردمن اوست گمانی که مپرس
زلف دل داد بما کاکل او باز ربود      سود ما را بقفا بود زیانی که مپرس
گر دل از ما ببرد غنچه این باغ چه دور      مید هد از دهن یار نشانی که مپرس
گفتگو نگهش عین بلاغت دارد      میکند کشف معانی به بیانی که مپرس
نیست آسان زخم ابروی او جان بردن      دست تقدیر کشیده است کمانی که مپرس

دوش میرفت فقیر از پی مکر خساری
نو بهاری بقفا داشت خزانی که مپرس

※

چون رحمت تو عرصه دهد دستگاه خویش      زیبد مرا که ناز کنم بر گناه خویش
بر خاطر حیای تو هر لحظه می خورد      شرمنده ام ز شوخی طرز نگاه خویش
مغرور تر ز کثرت عشاق کشته      شه را رسد که ناز کند بر سپاه خویش
روزی بدامن تو اگر دست من رسد      پیش رقیب عرضه دهم دستگاه خویش
خود کشته محو عکس زنخدان خویش یار      یوسف فتاده است عزیزان بچاه خویش
بیرون ز خویش وسعت سیری ندید دل      چون آب رفته آمدم آخر بجوی خویش
دل برده است از برم آن دشمن وفا      این ساده را مباد برادر بجوی خویش

دیگر فقیر بار گلیمت[۱] برون مکش
با خوشدلی بساز به بخت سیاه خویش.

※

آن فتنه ها که دیده ام از چشم یار خویش      دوران ندیده است زلیل و نهار خویش

۱؎ پا ز گلیمت   کلیات ورق ۵۹ -

جز فکر عشق نیست مرا مایهٔ نشاط　　چون گل شگفته میشوم از خار خار خویش
در چاره کی کند جگر تشنه مرا　　خود آب گشت و هیچ نیاید بکار خویش
پیش رقیب سخت تر آورد یار را　　خجلت کشیدم از مژه اشکبار خویش
ایدل طپیدن اینهمه در دام بهر چیست　　صیاد ما که نیست بفکر شکار خویش
جانان تو خود بوعده نکردی وفا دلی　　این جان بیقرار نخفت از قرار خویش
شاید بخاطر تو غباری ز من رسید　　دامن کشان گذشتهٔ از خاکسار خویش
با ما حریف حرف کجا می شود رقیب　　دارم تیغی از سخن آبدار خویش

داری هوای عالم تجرید اگر فقیر
بر خاک همچو نخل مینداز بار خویش

⁂

بزلفش دل ز عارض میکند شبگیر در آتش　　تو گوئی میرود دیوانه با زنجیر در آتش
بود سوز محبت خضر راه راست سالک را　　کجی را میتوان بردن برون از تیر در آتش
چو مشتاقانه جا داد است در پهلو خدنگش را　　دل من می طپد از حسرت نخچیر در آتش
مثالی خواست مانی از گل رویت بر دارد　　ز عجز افگند آخر خانهٔ تصویر در آتش

محال است اینکه ترک عشق او گوید فقیر آری
نخواهد شد سمندر تا قیامت سیر در آتش

⁂

دل بوجد آید کند چون آن بت بیباک رقص　　میکند با شعله وقت سوختن خاشاک رقص
همچو آن برقی که می تابد ز دامان سحاب　　در گریبانم ز مستی مینماید چاک رقص
شعله جواله آید حلقهٔ مجلس بچشم　　چون کند در انجمن آن دلبر چالاک رقص
جلوهٔ معشوق در وجد آورد عشاق را　　میکند از مهر تابان ذره های خاک رقص



شوخی از خوبان سرکش زیبد و عجز از فقیر
از زمین افتادگی می آید از افلاک رقص

⁂

ز عمر نیست مرا جز وصال یار غرض　　بجز نظارهٔ گل نیست از بهار غرض
چگونه شکوه ز زخم جفای یار کنم　　مرا که نیست بجز خاطر فگار غرض
نزاع شیخ و برهمن ز راه نادانی است　　بود ز کعبه و بتخانه کوی یار غرض
نگاه یار چو صیاد در کمین دل است　　چه داشته است ندانم باین شکار غرض

ز فتنه خیزی آن چشم میدهد خبرم
دگر فقیر ندارم بروزگار غرض

⁂

هر دل که با میان تو شد گرم اختلاط　　ایمن بود ز بیم رسن بازی صراط
جز غم نشد از آن لب خندان نصیب ما　　حرفیست اینکه خنده جام آورد نشاط
او در دل است و دل بکف اختیار او　　این بوالعجب نگر که محیط آمده محاط
معنی جدا ز لفظ نگردد بهیچ حال　　حق را بود بخلق ازینگونه ارتباط
از حادثات اهل جهان را گذیر نیست　　در راه سیل ساخته اند این کهن رباط
از کار بستهٔ غنچه صفت تنگدل مباش　　هر انقباض را ز قفا هست انبساط

هر کس فقیر نیست مقید بکر و فش
در چشم اهل دید بود شاه زین بساط

⁂

ترا ز عشق نداری ز حسن یار چه حظ　　چو عندلیب نهٔ از گل بهار چه حظ
به پیر جام تو بیعت نکردهٔ زاهد　　ترا ز گردش آن چشم میگسار چه حظ

تراکه دل نسپردی به نیش مژگانی　　زکاوکاو چه لذت زخار خار چه حظ
اگر نه گردش چشمی درین میان باشد　　زگردش فلک و دور روزگار چه حظ
زخندهٔ نمکین گرندار کی نخسنی　　ستم کشان ترا از دل فگار چه حظ
حدیث عشق نیابد بعقل هرگز راست　　ز ذوق عالم مستی به هوشیار چه حظ
خطش چو سرمه عزیز است اهل بینش را　　بتوکه چشم نداری ازین غبار چه حظ
تراکه تیغ بکف قاتلی نکشت دوچار　　زالامان چه تمتع ز زینهار چه حظ

دروغ وعدهٔ ما را فقیر میدانی
ز اشتیاق چه حاصل ز انتظار چه حظ

٭

از رخ بکش نقاب و بریز آبروی شمع　　پروانه تا نظر نکند باز سوی شمع
این حسن دلفریب بقید جهات نیست　　در انجمن بهر طرفی هست روی شمع
سیراب شد ز عشق نهال وجود ما　　آبی بغیر شعله که آرد بجوی شمع
از بیم خوی دلبر آتش مزاج من　　در بزم گریه گشته گره در گلوی شمع

درد است اصل طاعت روشندلان فقیر
کافی است آب دیده برای وضوی شمع

٭

از نسیم ناله ام در سینه ام شد تازه داغ　　یاری طالع به بین کز باد روشن شد چراغ
پی بسوز سینهٔ ما مدعی از ناله برد　　آنچنان کز دود[1] میگیرند آتش را سراغ
کسب فیضی میتوان کرد از دل بیعشق هم　　سرکشی را میرسد از شیشهٔ خالی دماغ
تا برآید بوی گل از غنچه سرگردان شود　　نیست غیر از خلوت دل در جهان کنج فراغ
پیش عارف جملهٔ عالم مظهر یکتائیست　　در نظر پروانه را باشد چراغان یک چراغ

[1] دود — دیوان (خدابخش)



عشق بازی در لباس از ما نمی آید فقیر
بوی پیراهن خورد یعقوب ما را بر دماغ

٭

از شعله گداخته پر شد ایاغ داغ　　کرد است فیض عشق مرا تر دماغ داغ
بلبل ز بوی گل بچمن راه می برد　　از دود آه خویش گرفتم سراغ داغ
کو شمع بر مزار شهیدان او مباش　　کافیست خاک سوختگان را چراغ داغ
همچون نسیم صبح که آید سوی چمن　　آید خیال دوست بگلگشت باغ داغ

از آرزوی یک گل داغی در آتشیم
آخر فقیر سوخت مرا سوز داغ داغ

٭

بود چو قبله نما چشم من براه نجف　　قسم بسرمهٔ خاک حریم شاه نجف
مرا خیال نجف گشته است دامنگیر　　گل بهشت نخواهم بخار راه نجف
ز سیل حادثهٔ دیگر گریزگاهی نیست　　توان کشید دلا رخت خود بشاه نجف
بدیدهٔ که طلبگار نور ایمان است　　کدام سرمه بود به ز خاک راه نجف

بجستجوی خضر کی روم ز راه فقیر
صلای عمر ابد میزند گیاه نجف

٭

ای طرهٔ شبرنگ چون روزگار عاشق　　رخسارهٔ تو گلگون همچون کنار عاشق
امروز اگرچه از ناز سویش نظر نداری　　روزی رسد که گردی حیران کار عاشق
گر بشنوی که هجران او را چگونه فرسود　　کحل بصر نمائی مشت غبار عاشق
روزی اگر نشینی در انتظار یاری　　شاید که رحمت آری بر انتظار عاشق

هر پارهٔ ازان شد آئینه دار رویت — آخر دل شکسته آمد بکار عاشق
ناصح ز بیقراری کوی که منع دل کن — دل دیدهٔ که باشد در اختیار عاشق
دایم ز اشک خونین گل در کنار دارد — ایمن ز انقلاب است فصل بهار عاشق

بیتابی فقیرت آورد بر سر رحم
آخر طپیدن دل آمد بکار عاشق

⁂

در جهان دیگر ندارم غم ز آسیب هلاک — حیثما افنیتنی البقیتنی روحی فداک
مطلبم از سیر دنیا جلوه دیدار تست — لو تری عینی الیها لیس منظوری سواک
دل بزور از پهلویم میبرد پیکان ترا — قلت دع هذا متاع لی دلک بالاشتراک
تا ترا دیدم شدم از قید هستی بی نیاز — ذات قلبی فی بقائک غاب فقری فی غناک

بر سر راهی فقیر آن شوخ با من شد دوچار
قال انظر الینا قلت لا انظر سواک

⁂

از مهر علی یافت فروغ این گهر دل — صد جان کرامست بقربان سر دل
ای آنکه طلبگار کشود دل خویشی — بی حب علی وا نشود قفل در دل
هر موی زبانی است بذکر شه مردان — از بس به تنم کرده سرایت اثر دل
تا چشم دلم روشنی از مهر علی یافت — حقا که فتاده است دو کون از نظر دل
خواهی که دل گمشده خویش بیابی — در عشق در آویز که گوید خبر دل
گر دیده بینا بتو بخشند به بینی — کآتشکدهٔ هست نهان در شرر دل

مفتون هوس میوه فردوس ندارد
از مهر شهنشاه رسیدش ثمر دل



خیالی اوست شمع خانهٔ دل — عجب گنجیست در ویرانهٔ دل
ندانم منزل جانان کدام است — نشانی میدهند از خانهٔ دل
بمجنون محمل لیلی مبارک — من سرگشته ام دیوانهٔ دل
ز شوخی آشنای چشم دارم — که باشد یاد او بیگانهٔ دل
فلاطون خم نشین کردید عاشق — خراب گوشه میخانهٔ دل
اگر میلی بخواب ناز داری — ز عاشق گوش کن افسانهٔ دل

ازین ویرانه ره بردم به گنجی
فقیر آباد باد خانهٔ دل

⁂

حریم خاص جانانست این جانی که من دارم — متاعی نیست جز یوسف بدکانی که من دارم
دلم یکتای معشوق را آئینه دار آمد — بود یک سورهٔ توحید قرآنی که من دارم
غباری نیست از من خاطر شیخ و برهمن را — بکفر و دین ندارد کار ایمانی که من دارم
زمین بر وسعت میدان خود کو ناز کمتر کن — ندارد وسعت کوی گریبانی که من دارم

فقیر از داغهای دل مرا گنجیست در پهلو
ندارد بادشاه وقت سامانی که من دارم

⁂

دل صاف از غبار کینه دارم — سکندر طالعم آئینه دارم
چنان با دل مرا روی نیاز است — که پنداری ترا در سینه دارم
باین آتش که عشقم در دل افروخت — هوای خرقهٔ پشمینه دارم
ز بخت تیرهٔ خود شکوه ام نیست — شکایت از شب آدینه دارم

چرا نالم فقیر از تنگدستی
ز نقد داغها گنجینه دارم

قطره گوهر شد ز دور آسمان ماهچنان    ذره گشت ارتاب خور برتوفشان ماهچنان

شبنم از یک جذبه سوی مهرتابان راه برد    پای بند رنگ و بوی گلستان ماهچنان

بیقراران طلب چون موج بر دریا زدند    همچو ساحل برکناریم ازمیان ماهچنان

سالکان جستند از دنیا و عقبی همچو تیر    در کشاکش زین دو خا چون بجان ماهچنان

شاهبازان در هوائے قدس وا کردند بال    بسته همچو بیضه دل در آشیان ماهچنان

شد بهار و گل بسر زد خار دیوار از چمن    پایمال راه چون مرگ خزان ماهچنان

یوسف جاز شده مفرد ل تا تختگاه    همچو گرد اندر قفای کاروان ماهچنان

صبح پیری گرد سرتا پای ما کافور خیز    همچون شمع از حرص تب در استخوان ماهچنان

خال از تیر حوادث گشت کیش آسمان    ناوک بیداد خوبان رافشان ماهچنان

نقد قلب یغرا گج گشت در بازار وصل    در فراق اندر گداز امتحان ماهچنان

هر شکر شد کام یغراز ذوق پیغامش فقیر
تلخ کام از لعل شیرین لبان ماهچنان

⁂

تو در میان جانی جان برکنار از تو    در دل قرار داری دل بیقرار از تو

رفتی و بیتو داریم حالی که کس بنیاد    من شرمسار از دل دل شرمسار از تو

از رفتن تو بر دل داغی بیاد کار است    الوای گر نمیداشت این یادگار از تو

یارب که لذت زخم بردی حرام بادا    مرهم اگر بخواهد جان فگار از تو

صد داغ حسرت از دل گل کرده از فراقت    باغ امیدم آورد این گل ببار از تو

از گلشن تو اغیار بردند گل بدامن    بهر دل مرا نیست جز خار خار از تو

ای شعله رو ندارند یغراز فنا علاجی    عشاق در جدائی همچو شرار از تو

بر تو چه نیست از من گر جان کنم نثارت    زیرا که در حقیقت هست این نثار از تو



از دست دیدهٔ و دل در آب آتشم من...[1]    چشم اشکبار دارم دل داغدار از تو

ای گل خبر نداری از شور بلبلانت
در ناله چون فقیر اند چندین هزار از تو

⁂

ای نازنین که عاشق بسیار دیدهٔ    انصاف ده که همچو من زار دیدهٔ

سودا بنقد جان نکنی حق بدست تست    بر دور خود هجوم خریدار دیدهٔ

پهلوی من اگر بنشینی چه می شود    در باغ اختلاط گل و خار دیدهٔ

مه بودیٔ و کنون شدهٔ رشک آفتاب    بیوجه نیست گرمی بازار دیدهٔ

در فکر صید لاغری پروای ما نیست    ما را بدام خویش گرفتار دیدهٔ

گر گفته ام که جانب من هم نگاه دار    برغم من بجانب اغیار دیدهٔ

لخت جگر بدامن من همچنان ببین    گر لاله را بدامن کهسار دیدهٔ

ذوق حضور کعبهٔ صاحبدلان[2] بپرس    حاجی تو خود همین در و دیوار دیدهٔ

دیگر فقیر رشک فغانیست نالات
معلوم می شود که رخ یار دیدهٔ

⁂

داغی که سوختم ز غم ماه پارهٔ    بر آسمان دل شده روشن ستارهٔ

دامان او بدست رقیبان فتاده است    در دست ما نمانده بجز جیب پارهٔ

با اشک پاره های دل از دیده ریختم    از بار دل شدیم سبکسار پارهٔ

گر دخط تو مژدهٔ ساحل بما رساند    ورنه نداشت قلزم حسنت کنارهٔ

مردیم و حسرت دم تیغت ز دل نرفت    می یافتیم کاش حیات دوبارهٔ

---

[1] کرم خورده ۔ [2] صاحبان دیوان: کتابت کی غلطی ہے۔

وصل تو کردہ چارۂ درد دل رقیب — بیچارہ من کہ راہ ندارم بچارۂ
خوبان بدو حسن تو از ہیچ کمتر اند — در خبثؔ[1] آفتاب چہ ارزد شرارۂ
بی شغل عشق دوزخ من کشتہ زندگی — می خواہم از خدای بہشت نظارۂ

آخر ز دست دل چو نعانی شدم فقیر
سرگرم جلوۂ و خراب نظارۂ

⁂

گرہ از زلف مشکیں وانکردی کاش میکردی — ز سر این فتنہ را برپا نکردی کاش میکردی
ز دیر و کعبہ جستی کام جانرا دور افتادی — تلاشی بر در دلہا نکردی کاش میکردی
نمک پاش نصیحت بر دل ریشم شدی ناصح — نظر بر آن رخ زیبا نکردی کاش میکردی
بروز ما نشینی[2] عاقبت در روزگار خط — ز دود آہ ما پروا نکردی کاش میکردی
دمی چون غنچہ با من وانکشتی از حجاب آخر — چو بوی گل مرا رسوا نکردی کاش میکردی
بجان ہر بوالہوس ذوق خریداری رادارد — تو برخ غمزہ را بالا نکردی کاش میکردی

فقیر آخر دل خود را باین سنگین دلان بستی
تو فرق از شیشہ تا خارا نکردی کاش میکردی

⁂

ای دل اگر یار مہربان تو بودی — مہر فلک خاک آستان تو بودی
بلبل اگر طالع تو اوج گرفتی — بر سر شاخ گل آشیان تو بودی
خاک من اکسیر گشت لیک چہ حاصل — کاش غباری بر آستان تو بودی
تو خط من گر بہار روی تو دیدی — منفعل از جلوۂ خزان تو بودی
گشتہ نصیب کہ بی نظیر جہانی — ہم چو خودی کاش در کمان تو بودی

۱ جنب ۔ کلیات ورق ۸۹ ۔ ۲ نشستی کلیات ورق ۹۰



قدر اگر داشتی فقیر کلامت
یار سخن فہم قدر دان تو بودی

⁂

ہمچو چشم یار مستم یللی — روز و شب ساغر پرستم[1] یللی
از سر دنیای دون برخاستم — بر سر کوی نشستم یللی
سینۂ افلاک را در انتقام — از خدنگ نالہ خستم یللی
چارۂ مجنون ما زنجیر بود — دل بزلف یار بستم یللی

زلف او زنجیر پایم شد فقیر[2]
از کمند چرخ رستم یللی

⁂

ہر گردش[3] چشم تو خریدیم بجانی — ارزان ندہد دست چنیں رطل گرانی
در کوی طلب رہزن ما راہنما ماست — بت در رہ تحقیق بود سنگ نشانی
گر عشق بچشم تو کشد سرمۂ اسرار — ہر مو ربود در نظرت موی میانی
از عشق نباشد اثری اہل ہوس را — نشنیدہ کس از بلبل تصویر فغانی
از ناوک مژگان تو صیدی نبرد جان — کز غمزہ کمنی و را بردست کمانی
در مشہد عشاق گذر کن کہ ببینی — ہر قالب بیجان شدہ سرمایہ جانی

آسودہ دلی بود فقیر از غم عشقم
[illegible] برای دل من آفت جانی

⁂

۱ بدستم کلیات ورق ۹۸ ، ۲ دیوان میں کاتب سے فقیر چھوٹ گیا ہے ، ۳ ہر طرز نگاہ ق ۔ ۹۸

# رباعیات

بسم الله که هست سرمایهٔ جان
جمع است درو تمام اسمای جهان
هرچیز که باشدش بعالم نامی
خود آن همه حضرت سمائش[1] دان

در چشم کسی که صائب عرفان است
واجب پیدا بصورت امکان است
زین[2] گونه که حرف و صوت خیزد ز نفس
پیدای خلق از نقش رحمان است

هر جزوی و کلی که بود در افواه
برهان خداست پیش مرد آگاه
ترتیب مقدمات جسم و جان را
در منطق ما نتیجه باشد الله

در دیده عارفی که جانش بصفاست
کثرت همه از جلوه وحدت برپاست
یک شمع هزار می نماید به نظر
در آئینه خانه این حقیقت پیداست

در باطن هر ذره خدای دو جهان
عرشی دارد ز چشم ادراک نهان
بر هر عرش است مستوی با اسمی
این باشد سر آیة الرحمان

[1] سمایش کلیات ورق ۹۹ [2] زان گونه. کلیات.



ای دل همه تو جان همه تو تن همه تو
گوش شنوا و چشم روشن همه تو
بی من تو غنی بذات ای تو همه تن
من بی تو ز هیچ کمتر ای من همه تو

این عالم با همه شیون و درجات
ذاتی ست عیان برنگ اسما و صفات
هرگز نشود عدم وجود ای غافل
تحصیل حاصل است نفی و اثبات

این دهر همان بیک قرار است که بود
وین چرخ هما بیک مدار است که بود
هر سال بهار تازه آید لیکن
چون در نگری همان بهار است که بود

عفویش چو گناه را طلب گار آید
سجاده بدوش زاهدان بار آید
آنجا که ز کفر عشق گیرند شمار
تسبیح تو شیخ کم ز زنار آید

عالم که بود ظهور اسما و صفات
از کثرت خلل نیفتد در ذات
دریاب که از قدیم و حادث رمزیست
لوح محفوظ و لوح محو و اثبات

حق را بدل شکسته منزل گاه است
از جادهٔ انفاس بسویش راه است
هان سهل مبین که انکسار فقرا
آئینهٔ کبریای شاهنشاه است[1]

ای کم رو وادی قیاس و برهان
در معرفت جزی و کلی حیران
کبری است ولایت ز نبوت صغری
زین هر دو نتیجه مصطفی را میدان

[1] گاہی راہی شاہنشاہی کلیات، ورق ۱۰۰

در ملک وجود بادشاه است علی — جان و تن عقل را پناه است علی
چشم همه کاینات ختم رسل است — در مردم آن چشم نگاه است علی

آنی که علی عالیت می خوانند — در کشور علم والیت می خوانند
چون رتبهٔ مصطفی مقدم آمد — در منطق شرع تالیت می خوانند

در چشم محققی که او معنی جواست — مغز است ولادت و نبوت چون پوست
حیدر مابین نوح و آدم آسود — خاک نجف آئینهٔ این سر نگواست

ای میر عرب میر عجم دستم گیر — ای قبلهٔ ارباب ہمم دستم گیر
از اوج ثریا بثری افتادم — آخر نه فتادهٔ توام دستم گیر

شاهی که ازو یافت دو عالم تزمین — شد نور ولایتش چراغ ره دین
دوران خاتمی نگینش احمد — الله بود بران نگین نقش مبین

آن را که بجان طالب فیض ازلی است — از بعد نبی بحق رسانندهٔ علی[1] است
شرط تکلیف چیست ارسال رسل — از روی یقین جزای این ثمره علی است

هر لحظه اگرچه ره بجای داریم — مانند علی راهنمای داریم
ای آنکه صنم پرست خوانی ما را — آگاه نه که ما خدای داریم

[1] دلی کلیات ورق ۱۰۰



دل مست محبت حسین ابن علی است — جان عاشق طلعت حسین ابن علی است
حقیقت اہل بیت بر خلق جہان — ثابت ز شهادت حسین ابن علی است

بیدل که ز دل زنگ تعصب نسترد — از رسم عزای سرور دین بد برد
چون ساختن صورت حال شهدا — نفع بزند بود بر طبعش برد

آن حسن ازل که بود گنجی پنهان — از وی بجنابه مصطفی داد نشان
چون پرده علی زان رخ زیبا برداشت — بنمود بعارفان بتصریح عنان

ای پیروی تو رهبر راه وصول — حیران شد کهنه تو ادراک عقول
از دست رس تو من چه گویم کر قدر — پای تو رسیده است بر دوش رسول

ای غائب و آشکار چو ذات خدا — در عین خفا و چشم معنی پیدا
ما از دل و جان منتظر روی توایم — بردار نقابی و خدا را بنما

بنیاد شکیب را شکستی دادیم — دل را بردم به ترک مستی دادیم
مشکل که دگر توانمش باز گرفت — آئینه بدست خود پرستی دادیم

زاهد که بطعن رند بیباک بود — بر طاعت خود سخت فرحناک بود
آنجا که زند محیط بخشایش موج — آلوده کسی که دامنش پاک بود

دل سلطانی بود تن او را بنده است	از مردن تن پاک اگر دل زنده است
خود رشتہ بی گہر نیرزد چیزی	گوہر بی رشتہ گر بود او زنده است

مائیم دلای خاندان تطہیر	کو خارجی و ناصبی از غصہ بمیر
منگر زحد ہمیشہ در رنج خمار	نامست بنام از می خم غدیر

از در نجف مباش غافل ای دوست	بی رمزی نیست شکل موی کہ در دوست
یعنی کہ رہ کعبہ دین شاہ نجف	چون آئینہ روشن است باریک چو موست

آن عاشق زار ناتوان تر زگیا	کز رحمت ایزد بہ نجف یابد جا
چون موی در نجف تن لاغر او	مستغرق نور حق بود سر تا پا

فردوس منور از جمال زہرا	ایمان شده کامل از کمال زہرا
زان شاہد دین چہره بخوبی افروخت	گلگونہ اوست رنگ آل زہرا

درحضرت فقر دستگاہی عجب است	شان عجبی شوکت و جاہی عجب است
با وسعت دل وسعت دنیا ہیچ است	در عالم خود فقیر شاہی عجب است

درویشی غیر خودشناسی نبود	این شیوه شعار ہر لباسی نبود
این قاعده را اساس نحوی دگر است	از باب سماعی و قیاسی نبود



# باب ۱۱

## کتابیات

(۱) تذکرہ ریاض الشعراء قلمی : علی قلی خاں والہ داغستانی : خدابخش لائبریری

(۲) خزانہ عامرہ مطبوعہ آزاد بلگرامی یونیورسٹی لائبریری پٹنہ

(۳) آتش کدہ مطبوعہ حاجی لطف علی بیگ آذر چھاپ بمبئی

(۴) سفینۂ خوشگو مطبوعہ بندرابن داس خوشگو مرتبہ عطا کاکوی

(۵) گل رعنا قلمی لچھمی نرائن شفیق خدابخش لائبریری

(۶) مجمع النفائس قلمی سراج الدین علی خان آرزو "

(۷) مردم دیدہ مطبوعہ عبدالحکیم حاکم لاہوری ٹی این بی کالج

(۸) عقد ثریا مطبوعہ مصحفی گورنمنٹ اردو لائبریری پٹنہ

(۹) مخزن الغرائب قلمی حصہ اوّل علی احمد خان ہاشمی سندیلوی خدابخش پٹنہ

(۱۰) " " حصہ دوم " "

(۱۱) نشتر عشق " حسین قلی خان عاشقی عظیم آبادی خدابخش لائبریری پٹنہ

(۱۲) نتائج الافکار مطبوعہ محمد قدرت اللہ گوپاموی چھاپ بمبئی

(۱۳) تذکرہ ریاض العارفین رضا قلی خان ہدایت

(۱۴) شمع انجمن صدیق حسین خان

(۱۵) سفینۂ ہندی مطبوعہ بھگوان داس ہندی مرتبہ عطاء الرحمٰن عطا کاکوی

(۱۶) سیر المتاخرین مطبوعہ منشی غلام حسین خان طباطبائی

(۱۷) سرو آزاد مطبوعہ آزاد بلگرامی گورنمنٹ اردو لائبریری پٹنہ

(۱۸) ید بیضا " خدابخش لائبریری پٹنہ





(۱۹) تذکرہ بینظیر مطبوعہ عبدالوہاب مطبوعہ الہ آباد

(۲۰) مقالات شبلی جلد پنجم مطبوعہ اعظم گڑھ

(۲۱) قاموس المشاہیر مطبوعہ جلد اوّل، دوم۔ نظامی بدایونی خدابخش پٹنہ

(۲۲) تواریخ اودھ مطبوعہ سید کمال الدین حیدر لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری

(۲۳) تاریخ اودھ جلد اول، دوم۔ نجم الغنی خاں مطبوعہ نولکشور

(۲۴) دیوان والہ داغستانی قلمی رضا لائبریری رام پور

(۲۵) مثنوی والہ و سلطان " فقیر دہلوی خدابخش لائبریری پٹنہ

(۲۶) " " " کتابخانہ جعفر سلطان القرائی

(۲۷) مثنوی شمس الضحیٰ " " خدابخش لائبریری پٹنہ تبریز

(۲۸) مثنوی در مکنون " " "

(۲۹) دیوان فقیر " " "

(۳۰) کلیات فقیر " " "

(۳۱) خلاصۃ البدیع " " "

(۳۲) حدائق البلاغت " " "

(۳۳) رسالہ در علم بیان " " "

(۳۴) قصائد عرفی مطبوعہ

(۳۵) احوال و افکار و آثار علی قلی خان والہ داغستانی ڈاکٹر عبدالغفار انصاری یونیورسٹی لائبریری بھاگلپور

(۳۶) صنادید عجم مطبوعہ مہدی حسین ناصری

(۳۷) تاریخ ادبیات ایران مترجم سید مبارز الدین رفعت

(۳۸) تاریخ محمد شاہی قلمی محمد بخش کوکلتاش آشوب

(۳۹) تاریخ عماد الملک مطبوعہ عبدالقادر خان عرف غلام قادر خان

(۴۰) گلشن بے خار مطبوعہ مصطفےٰ خان شیفتہ
(۴۱) چہار مقالہ " نظامی عروضی
(۴۲) شعر العجم جلد سوم " شبلی نعمانی
(۴۳) شعر العجم جلد چہارم " "
(۴۴) شعر العجم جلد پنجم " "
(۴۵) غزلہای حافظ چاپ تہران
(۴۶) دیوان خاقانی شروانی "
(۴۷) تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان مطبوعہ علی رضا نقوی
(۴۸) مجمع الفصحا (رضا قلی خان ہدایت)
(۴۹) تاریخ عماد السعادت نولکشور غلام علی نقوی
(۵۰) تاریخ فرخ آباد مترجم سید علی اللہ مطبوعہ
(۵۱) خلاصۃ الافکار قلمی ابوطالب "
(۵۲) دیوان غالب
(۵۳) دیوان حافظ
(۵۴) کلیات سعدی
(۵۵) دیوان امیر خسرو مطبوعہ تہران
(۵۶) دیوان بابا فغانی " "
(۵۷) دیوان صائب " "
(۵۸) دیوان اوحدی " "
(۵۹) دیوان شفائی " "
(۶۰) دیوان حزین " "



(۶۱) دیوان عرفی شیرازی مطبوعہ نولکشور
(۶۲) دیوان فیضی " "
(۶۳) رباعیات عمر خیام
(۶۴) دیوان منت خدا بخش
(۶۵) دیوان آصف "
(۶۶) گلشن گفتار از سید محمد ایم اے مطبوعہ
(۶۷) تذکرہ روز روشن مطبوعہ تہران
(۶۸) تذکرہ صبح گلشن از علی حسن خان خدا بخش
(۶۹) گنج سخن ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا "
(۷۰) نگارستان فارس مولانا محمد حسین آزاد
(۷۱) فرہنگ رشیدی ملا عبد الرشید چاپ تہران
(۷۲) نگارستان سخن سید نور الحسن ہاشمی
(۷۳) فرہنگ آنند راج ٹی۔ ان۔ بی۔ کالج
(۷۴) فرہنگ عمید حسن عمید چاپ تہران
(۷۵) فرہنگ لغات عامیانہ سید محمد علی جمالزادہ
(۷۶) تذکرہ شاعرات اردو جمیل احمد مطبوعہ
(۷۷) دیوان کمال الدین اسماعیل مطبوعہ تہران
(۷۸) شعر العجم فی الہند مطبوعہ ملتان
(۷۹) کلیات انوری مطبوعہ نولکشور
(۸۰) دیوان آذر خدا بخش
(۸۱) دیوان آرزو "

(۸۲) انیس الاحبا — خدابخش

(۸۳) خمخانۂ جاوید جلد دوم

(۸۴) تذکرۃ الاحوال مطبوعہ

(۸۵) تذکرہ شعرائے اردو مطبوعہ

(۸۶) مقالات شبلی

(۸۷) تذکرہ خوش نویسان مطبوعہ

(۸۸) تذکرۂ عشقی

(۸۹) تذکرہ شعرفارسی وسلاطین وامراء

(۹۰) تذکرہ سخنوران بلند فکر

(۹۱) تبصرۃ الناظرین

92. Cat. India office Library; vol. I London.
Dr. Ethe.

93. Cat. Khuda Bakhsh oriental Public Library
vol. I, A. Muqtadir.

94. Cat. Khuda Bakhsh Oriental Public Library
vol. III, A. Muqtadir.

95. Cat. Khuda Bakhsh oriental Public Library
vol. VIII A. Muqtadir.

96. Cat. Kings of Oudh Library vol. I, Sprenger

97. The first two Nawabs of Oudh by Dr. Ashirbadi Lal Shrivastawa, Printed Lucknow,
T.N.B. College Library.





98. Cat. National Library, Buhar Section, Cal.

99. The Oriental Biographical Dictionary
by Thomas William Beale, Printed in London.

100. The Story of Valeh and Hadijeh by Mirza Mohammad and C. Spring Rice, Printed
in London - 1903.
Patna College Library, Patna.

101. IRAN by Aziz Hatimi, Printed in Tehran.

102. The Cambridge History of India vol. IV.

103. A Literary history of Persia by E.G. Browne
vol. IV, Cambridge University Press, 1959.

104. The history of Hindostan by Dow,
Printed in London.

105. The Fall of Mughal Empire.

106. Nadir Shah by James Fraser.

107. Cat. British Museum Lib. vol. II Dr. Rieu.

# شناسنامہ مؤلف

نام: محمد شہاب الدین

والد کا نام: محمد عبد الوہاب مرحوم و مغفور بن محمد عبد الوحید مرحوم و مغفور

(وفات والد محترم: ۴ جولائی ۱۹۵۷ء مطابق ۵ ذی الحجہ ۱۳۷۶ھ بروز جمعرات بعمر ۴۸ سال)

والدہ کا نام: حسینہ خاتون بنت محمد نصرت علی مرحوم و معصومہ خاتون مرحومہ

جائے ولادت و موجودہ سکونت: قاضی ولی چک، بھاگلپور (بہار)

## تعلیم

- ابتدائی:۔ والدہ محترمہ سے گھر پر بعد ازاں یتیم خانہ اسلامیہ، قاضی ولی چک، بھاگلپور میں حافظ محمد سالم مرحوم و مغفور سے۔
- درجہ پنجم یا میٹرک:۔ مسلم ہائی اسکول، بھاگلپور ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۴ء
- میٹریکولیشن:۔ مسلم ہائی اسکول، بھاگلپور سے ۱۹۶۵ء میں فرسٹ ڈویژن سے
- پری یونیورسٹی:۔ ٹی۔ این۔ بی کالج بھاگلپور سے ۱۹۶۶ء میں سکنڈ ڈویژن سے
- بی۔ اے۔ پارٹ ون:۔ " " ۱۹۶۷ء " "
- بی۔ اے۔ آنرز (فارسی):۔ " " ۱۹۶۹ء میں فرسٹ کلاس فرسٹ (گولڈ میڈلسٹ)
- ایم۔ اے۔ (فارسی):۔ پٹنہ یونیورسٹی سے ۱۹۷۱ء میں فرسٹ کلاس میں سکنڈ پوزیشن



- ایم۔ اے (اردو):۔ پٹنہ یونیورسٹی سے ۱۹۷۶ء میں۔
- پی ایچ۔ ڈی:۔ بھاگلپور یونیورسٹی سے فروری ۱۹۷۸ء میں۔

عنوان:۔ احوال و افکار و آثار: میر شمس الدین فقیر عباسی دہلوی۔

ازدواج:۔ شبانہ پروین بنت جناب محمد اکبر علی مرحوم و نجم النساء مرحومہ ساکنان قاضی ولی چک کی چھوٹی صاحبزادی سے ۵ مئی ۱۹۷۷ء مطابق ۱۶ جمادی الاول ۱۳۹۷ھ میں بمقام قاضی ولی چک، بھاگلپور (بہار)

اولاد
- محمد علی شاہد (پیدائش: ۲۵ مئی ۱۹۷۸ء مطابق ۱۷ جمادی الآخرہ ۱۳۹۸ھ)
- گیسو دراز سلمیٰ (پیدائش: ۱۵ جون ۱۹۸۲ء مطابق ۲۲ شعبان ۱۴۰۲ھ)
- شوکت علی عابد (پیدائش: ۱۴ جون ۱۹۸۴ء مطابق ۱۳ رمضان المبارک ۱۴۰۴ھ)

ملازمت:
- ٹیچر اور وارڈن: انسان اسکول، کشن گنج، پورنیہ (۲۹ جنوری ۱۹۷۶ء تا ۱۸ جون ۱۹۷۸ء)
- لکچرار فارسی و اردو: ایل۔ ایس۔ کالج، بہار یونیورسٹی، مظفر پور (۱۹ جون ۱۹۷۸ء تا ۱۷ جنوری ۱۹۷۹ء)
- لکچرار فارسی:۔ ٹی۔ این۔ بی۔ کالج، بھاگلپور یونیورسٹی، بھاگلپور ۱۸ جنوری ۱۹۷۹ء تا دم تحریر

## تالیفات:

- احوال و افکار و آثار: میر شمس الدین فقیر عباسی دہلوی
- خواجہ عبد اللہ تائید: زبان و ادب (مئی، جون ۱۹۷۹ء)
- بھگوان داس ہندی: گلبن، سالنامہ (دسمبر ۸۳ء، جنوری ۸۴ء)

# مختصر احوالِ زندگی

ناخدا جس کا نہ ہو اس کا خدا ہوتا ہے

میری پیدائش میرے ننہیال محلہ قاضی ولی چک، بھاگلپور (بہار) میں ہوئی۔ سنِ شعور کو پہنچنے پر میں نے اپنے والد محترم (محمد عبدالوہاب مرحوم و مغفور) کو جوتے کی ایک دکان میں ملازمت کرتے ہوئے دیکھا۔ والدہ محترمہ سے معلوم ہوا کہ پہلے وہ ریلوے میں ملازم تھے لیکن ریلوے کی ملازمت ان کو پسند نہ تھی اس لئے ریلوے کی ملازمت ترک کردی تھی۔ اس وقت میرے دادا سید "وحید" مرحوم و مغفور محلہ خلیفہ باغ، بھاگلپور میں رہتے تھے اور سید شاہ فخر عالمؒ سجادہ نشین آستانہ بابا دمڑیا شاہ کے یہاں منشی تھے۔ ان کا انتقال ۱۹۵۵ء میں ہوا۔ میرے والد محترم اکلوتی اولاد تھے اور اس وقت وہ خلیفہ باغ میں سکونت پذیر تھے۔ ان کی آمدنی اتنی قلیل تھی کہ میری تعلیم کا باضابطہ کوئی انتظام ممکن نہ تھا۔ تنگ دستی کی وجہ سے مجھے درزی کی ایک دکان پر سلائی کا کام سیکھنے کے لئے بیٹھا دیا گیا۔ لیکن صبح کے وقت روزانہ میری والدہ محترمہ مجھے پڑھاتی تھیں۔ میرے والد محترم نے ۳۸ سال کی عمر میں ۴ جولائی ۱۹۵۷ء میں انتقال کیا۔ اس وقت میری عمر تقریباً آٹھ سال تھی، میری بڑی بہن عشرت کی عمر تیرہ سال تھی اور میری چھوٹی بہن زینت تین سال کی تھی۔ عسرت اور بدحالی کا یہ حال تھا کہ جس وقت والد محترم کا انتقال ہوا اس وقت گھر میں ایک وقت کے کھانے کا بھی کوئی سامان نہیں تھا۔ کسی طرح والد محترم کی تجہیز و تکفین کا انتظام ہوا۔ اس کے بعد ہم لوگوں کو کئی وقت کے فاقوں سے بھی دوچار ہونا پڑا تھا۔

میری والدہ محترمہ کی دیرینہ خواہش تھی کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کروں، لیکن



غربت نے تمام راستے مسدود کر رکھے تھے۔ والد محترم کے انتقال کے بعد والدہ محترمہ نے مجھے پڑھانے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ سید شاہ فخر عالمؒ اس وقت یتیم خانہ اسلامیہ، قاضی ولی چک، بھاگلپور کے صدر تھے۔ ان کی اعانت سے ۲۷ اگست ۱۹۵۷ء مطابق یکم صفر ۱۳۷۷ھ کو یتیم خانہ مذکور میں میرا داخلہ ہوگیا۔ ہم لوگ خلیفہ باغ سے آکر قاضی ولی چک میں رہنے لگے۔ یتیم خانہ میں حافظ محمد سالم مرحوم و مغفور جیسے استاد کی تربیت نے مجھے اس لائق بنا دیا کہ جنوری ۱۹۵۸ء میں مسلم ہائی اسکول، بھاگلپور میں میرا داخلہ درجہ پنجم میں ہوگیا۔ یوں تو اسکول کے تمام اساتذہ کی نظر عنایت مجھ پر رہتی تھی لیکن ڈاکٹر منیر احمد، سید نعیم الحسن، پنڈت بیجناتھ مشرا، مولانا قمرالہدیٰ اور محمد شمس الدین، اسکول میں مجھ پر بہت مہربان تھے۔ ۱۹۶۵ء میں میٹریکولیشن فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا۔ یتیم خانہ مذکور کے اصول کے مطابق میٹریکولیشن کے بعد مجھے وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ میں اپنی تعلیم کو جاری رکھنا چاہتا تھا لیکن کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا اسلئے پرائیویٹ ٹیوشن کرکے اپنی روزی روٹی حاصل کرنے لگا۔ کالج میں داخلہ کا وقت قریب سے قریب تر ہوتا جارہا تھا لیکن داخلہ فیس کا کوئی انتظام نہ ہوسکا۔ ایک روز مولانا عبدالرحمٰن قدوائی مرحوم و مغفور (مالک آپٹیکل ہاؤس، بھاگلپور) نے مجھ سے کہا کہ دوکان پر ملو گے، کچھ کام ہے۔ مولانا صاحب مرحوم کا میں پڑوسی تھا اور اس وقت بھی اسی مکان میں ہوں۔ وہ میری حالت سے پوری طرح واقف تھے۔ میرے والد محترم نے ان سے یتیم خانہ اسلامیہ، قاضی ولی چک کے مدرسہ میں پرائیویٹ طور پر ٹیوشن پڑھا تھا۔ ان دنوں مولانا صاحب مرحوم وہاں مدرس تھے۔ جب میں ان سے ملنے گیا تو انھوں نے پوچھا کہ کالج میں داخلہ لے لیا؟ میں نے نفی میں جواب دیا اور آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ انھوں نے سو روپے کا ایک نوٹ اپنی جیب سے نکال کر مجھے دیا اور کہا کہ کالج میں داخلہ لے لو پھر میں تمہارے لئے کسی اچھی جگہ ٹیوشن کا انتظام کردوں گا۔ اس وقت میری خوشی

کا ٹھکانہ نہ رہا۔ اسی روز میں نے ٹی۔ این۔ بی کالج، بھاگلپور میں پری یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ مولانا صاحب موصوف نے الحاج مولوی بدرالہدیٰ صدیقی صاحب مرحوم و مغفور کے یہاں میرے لئے ٹیوشن کا بھی انتظام کر دیا۔ صدیقی صاحب جمگاؤں (شہر بھاگلپور سے دس کلو میٹر پر ایک گاؤں ہے) کے رہنے والے تھے لیکن اپنے بچوں کی تعلیم کیلئے شہر بھاگلپور میں مولوی سعید احمد خاں صاحب ایڈوکیٹ کے مکان میں تاتارپور میں رہتے تھے۔ ۱۴ راگست ۱۹۶۵ء سے میں نے ان کے یہاں ٹیوشن شروع کیا۔ صبح اور شام دونوں وقت ان کے یہاں دو صاحبزادوں، علی منظر صدیقی اور علی اکبر صدیقی کو پڑھاتا تھا۔ وہاں مجھے ناشتہ، دونوں وقت کھانا، کالج کی فیس، تہوار پر نئے کپڑے وغیرہ ملتے تھے۔ صدیقی صاحب مرحوم مجھے اپنے بچوں کی طرح مانتے تھے۔ اس طرح دو سال گذر گئے اور میں نے پری یونیورسٹی اور بی۔ اے پارٹ ون پاس کر کے تھرڈ ایر فارسی آنرز میں داخلہ لے لیا۔

جناب الحاج بدرالہدیٰ صدیقی صاحب مرحوم نے میری چھوٹی بہن زینت اور میری شادی میں کل اخراجات کئے۔ جزاک اللہ۔ ۲۶ رجنوری ۱۹۸۳ء میں ان کا انتقال ہوگیا اور اس دن سے میں واقعی اپنے آپ کو یتیم سمجھنے لگا ہوں، لیکن آج تک اس خاندان کے افراد سے میرے تعلقات ہیں۔

ٹی۔ این۔ بی۔ کالج میں جناب پروفیسر سید صدرالدین احمد مرحوم اور ڈاکٹر عبدالغفار انصاری جیسے شفیق استادوں سے چار سال تک فارسی پڑھی اور ۱۹۶۹ء میں فارسی آنرز میں فرسٹ کلاس میں فرسٹ پوزیشن مجھے ملی۔ میں نے فارسی ایم اے۔ میں ۱۹۷۱ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے فرسٹ کلاس میں سیکنڈ پوزیشن حاصل کی۔ وہاں استاذ محترم پروفیسر سید حسن صاحب نے میرے علمی ذوق میں اضافہ کیا۔ ایم۔ اے۔ کرنے کے بعد تلاش معاش کی فکر دامنگیر ہوئی۔ ملازمت نہ ملنے کی



صورت میں میں نے اکتوبر ۱۹۷۲ء میں اپنے دوست محمد عثمان خان کے پارٹنرشپ میں کرانے کی دوکان کھولی اور ایک سال تک اس کام میں مشغول رہا۔

میری زندگی کو کامیابی کی طرف لے جانے میں میرے شفیق استاد پروفیسر عبدالغفار انصاری کی خاص توجہ رہی ہے۔ ان کی رہنمائی نے آج مجھے اس مقام پر پہنچا دیا ہے۔ ۲۸ راکتوبر ۱۹۷۳ء مطابق یکم شوال ۱۳۹۳ھ کی بات ہے کہ میں جامع مسجد خلیفہ باغ میں عید الفطر کی نماز ادا کرنے گیا تھا۔ وہاں استاد محترم ڈاکٹر عبدالغفار انصاری سے ملاقات ہوگئی۔ انھوں نے اپنے دولت کدہ پر مجھے ملنے کو کہا۔ جب میں ان سے ملا تو انھوں نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا کہ کوئی شخص کسی درخت کی آبیاری کرتا ہے تو اس کی دلی تمنا ہوتی ہے کہ اس درخت میں پھل بھی آئے۔ میں نے تمھیں چار سال پڑھایا ہے اس لئے تمھیں دوکان میں ڈنڈی ترازو اٹھاتے ہوئے دیکھ کر مجھے سخت تکلیف ہوتی ہے۔ میں نے اپنی مجبوری ظاہر کی تو انھوں نے مشورہ دیا کہ تم اردو میں ایم۔ اے۔ کی تیاری کرو اور میری نگرانی میں پی ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری کے لئے مقالہ لکھنا شروع کرو، انشاء اللہ لکچرار ہو جاؤ گے۔ میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ تم ٹی۔ این۔ بی کالج کے اسٹاف روم میں لکچرار کی حیثیت سے بیٹھے ہوئے ہو۔ میں جب واقعی ۱۹۷۹ء میں ٹی۔ این۔ بی۔ کالج میں شعبۂ فارسی میں لکچرار ہو گیا تو استاذ محترم سے کہا کہ کیا واقعی آپکو میرے لکچرار ہونے کا علم تھا؟ انھوں نے مجھے بتایا کہ میں نے تو محض تمھاری ہمت بڑھانے کے لئے ایسی بات کہی تھی اور میں عام طور پر شاگردوں کو ایسی ہی ہمت افزا باتیں کہتا ہوں۔

میں نے دوکانداری چھوڑ دی اور ریسرچ شروع کیا، مگر ٹیوشن بھی ذریعہ معاش کے لئے جاری رکھا۔ ۲۹ رجنوری ۱۹۷۴ء میں ٹیچر اور وارڈن کی حیثیت سے السنان اکول کشن گنج میں میری ملازمت ہوگئی۔ اس درمیان ۱۹۷۶ء میں میں نے پٹنہ یونیورسٹی

سے اردو میں ایم۔ اے۔ کیا۔ انسان اسکول میں ڈائرکٹر ڈاکٹر سید حسن اور ہیڈ ماسٹر عبدالاحد کی صحبتوں میں میں نے مزید جفاکشی، محنت اور لگن کا مادہ اپنے اندر پیدا کیا۔ ڈاکٹر سید حسن کو بھی میں اپنے اساتذہ کرام میں شمار کرتا ہوں کیوں کہ انسان اسکول کی ملازمت کے دوران بہت سی کارآمد باتیں ان سے میں نے سیکھیں۔ ان کی جفاکشی اور ثابت قدمی سے میرے حوصلے پروان چڑھتے رہے۔ ان کا نعرہ "پڑھتے رہو بڑھتے رہو" ہمیشہ میرے پیش نظر رہتا ہے۔ انسان اسکول کی ملازمت میں رہ کر میں نے استاذ محترم ڈاکٹر عبدالغفار انصاری کی رہنمائی میں پی ایچ۔ ڈی کے لئے کام جاری رکھا۔ میں نے میر شمس الدین فقیر عباسی دہلوی" پر جون ۱۹۷۷ء میں اپنا مقالہ بھاگلپور یونیورسٹی میں داخل کیا اور فروری ۱۹۷۸ء میں یونیورسٹی مذکور نے مجھے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری سے سرفراز کیا۔ انسان اسکول میں میں نے تقریباً ڈھائی سال تک ملازمت کی اور ۱۹ رجون ۱۹۷۸ء میں ایل ایس کالج، بہار یونیورسٹی، مظفر پور میں بحیثیت لکچرار اردو و فارسی میں نے ملازمت شروع کی۔ بعدہٗ ۸ ار جنوری ۱۹۷۹ء میں میں ٹی۔ این بی۔ کالج بھاگلپور میں شعبۂ فارسی میں لکچرار ہو گیا۔ اس وقت استاذ محترم ڈاکٹر عبدالغفار انصاری شعبۂ مذکور کے صدر تھے۔ اور آج بھی میں نے ان کی رہنمائی اور سرپرستی میں اپنے مطالعہ کو جاری رکھا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ استاد کو زندگی بھر ایک طالب علم کی طرح مطالعہ کرنا چاہئے۔ میں حتی الامکان ان کے مشورہ پر عمل کرنے کی سعی کرتا ہوں۔ استاذ محترم کے نیک اور حوصلہ افزا مشوروں سے بہت سے شاگردوں کی زندگی آراستہ ہوئی ہے۔ ان کے شاگردوں میں ڈاکٹر محمد عرفان پرنسپل ملت کالج، پرسا، گوہر علی انصاری لکچرار رام دھین کالج شیخپورہ، ڈاکٹر محمد قمر الدین لکچرار مسلم مائنارٹی کالج بھاگلپور، ڈاکٹر حنان سبحانی لکچرار سہرسہ کالج سہرسہ، ڈاکٹر محمد صابر علی انصاری، محمد ارشاد اللہ انصاری اور کمال الدین مضطر ہیں۔

میں اپنے جملہ استاد اور کرم فرماؤں کا بیحد ممنون و مشکور ہوں۔



ارباب اقتدار فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں وہ کم ہوگا کیوں کہ انھیں حضرات کے تعاون سے میں اپنے احوالِ زندگی آپ تک پہنچا سکا۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم
چنانکہ حرف عصا گفت موسیٰؑ اندر طور
(عرفی شیرازی)

# Life and Works

OF

# Meer Shamsvddin Faquir Abbasi Dehlavi

BY


## Dr. Md. Shahabuddin

M. A. ( Persian & Urdu ) , Ph. D.

Lecturer in Persian
T. N. B. COLLEGE, BHAGALPUR
( BHAGALPUR UNIVERSITY, BHAGALPUR )
BIHAR



NIKHAR PUBLICATIONS
Maunath Bhanjan (U.P.) 275101